نثری اصناف تعارف و تفہیم حصہ اوّل

چوتھا سمسٹر بی ایس۔ اردو

تالیف: وہاب اعجاز خان

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بنوں

داستان

داستان افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ واقعات کو قوت متخیلہ کے سہارے بیان کرنے ہی کو فسانہ گوئی کہتے ہیں۔ فسانہ کے لغوی معنوی جھوٹی اور فرضی کہانی کے ہیں۔ لیکن ہر فسانے کے پیچھے کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ ہر واقعہ بیان ہوتے ہوئے کہانی بن جاتا ہے۔ کہانی افسانوی ادب کی کئی قسموں میں منقسم ہے۔ داستان قصہ، حکایت، ناول، اور مختصر افسانہ سب کہانی کی شکلیں ہیں اب تمام تر اصناف میں کوئی کہانی یا واقعہ ضرور ہوتا ہے۔ داستان کہانی کی قدیم اصناف میں سے ایک ہے۔ داستان کی روایت ان چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور روایتوں سے جڑی ہوئی ہے جن کا جنم انسانی زندگی کے ساتھ ہوا۔ انسان کی یہ فطری خواہش اور معاشرتی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے آلام و مصائب سے دور کسی فردوس میں رہ کر تمام شادمانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے اور اپنے دل و دماغ کی راحت کے لیے کوئی ذریعہ پیدا کرنے۔ داستان روز اول سے اس کے لیے تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ بن گئی۔

دراصل داستان ایسی ذہنی آسودگی کا نام ہے جو پریشانیوں کے احساس کو ختم کر کے نیند کی پرسکون وادی میں پہنچا کر حسین خوابوں کے جھروکے کھول دیتی ہے۔ داستان فرضی اور فرسودہ کہانیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کہانی کی طویل اور پیچیدہ صنف کو داستان کہا جاتا ہے۔ کہانی قصہ در قصہ ہو کر داستان بنتی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد

"داستان کہانی کی طویل اور پیچیدہ بھاری بھر کم صورت ہے۔"

داستان بنیادی طور پر سننے سنانے یعنی بیان کا فن ہے۔ داستانیں تحریری شکل میں آنے سے قبل سنائی جاتی تھیں۔ داستان گو داستان بیان کرتا تھا۔ داستان اس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت اور اطمینان کی افراط تھی۔ غم دنیا سے بے نیاز یہ لوگ اپنی تفریح کا سامان داستانوں سے فراہم کرتے تھے۔ داستان گو اپنے تخیلات کی مدد سے داستان کو اتنا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ سامعین حیرت کی دنیا میں غرق ہو جاتے تھے۔ داستان اور داستان گو کی کامیابی اسی میں تھی کہ وہ سامعین کی توجہ کو برقرار رکھے وہ داستان میں ایسے واقعات شامل کرتا تھا جو کہ سننے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتے۔ یوں۔ قصے میں حسن و عشق کی خوشنمایوں خیر و شر کی لڑائیوں اور مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے حیرت کی فضا پیدا کر کے پیش کرنے کا نام داستان ہے۔ داستان کے موضوعات محدود ہوتے ہیں۔ پوری داستان کا انحصار شہزادے اور شہزادی کی داستانِ عشق پر ہوتا ہے۔ لیکن انہی دو کرداروں کے سہارے داستان گو بے شمار مضامین پیدا کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر سننے والے کی دلچسپی کا سامان ایک ہی داستان میں فراہم ہو جاتا ہے۔ دراصل داستان جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ اسی معاشرے میں اس صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی وجہ سے داستانوں کی معاشرت اُسی دور کی عکاس ہے۔ داستانوں کے مرکزی کردار شاہی نظام کے افراد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ داستانوں کا ہیرو ہمیشہ کوئی شہزادہ ہوتا ہے۔ جس سے وابستہ کوئی سلطنت اور بڑی فوج ہوتی ہے۔ پوری کہانی اسی کے گرد طواف کرتی ہے۔

داستان بیان کا فن ہے جس کی کامیابی کا انحصار داستان گو کی قوت بیان پر ہوتی ہے۔ ہر داستان میں کہانی ایک ہی قسم کی ہوتی ہے لیکن داستان گو اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے چھوٹی سی کہانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناول کی فضا میں عوامی زندگی کی جھلک بہت کم ہوتی ہے۔ ناول افسانہ اور داستان میں یہی فرق ہے۔ ناول اور افسانہ زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں اور داستان میں حقیقت سے پرے باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود داستان میں اس کے عہد کی جھلکیاں شامل ہو جاتی ہیں اور اس میں اپنے زمانے کی تہذیب کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ حسن و عشق کی اس داستان کو بلاشبہ گذشتہ صدیوں کی تہذیبی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔

عناصر ترکیبی:

طوالت:

طوالت داستان کے فن کا بنیادی عنصری ہے۔ داستان اُس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت کی افراط تھی۔ ایسی صورت میں وقت گزاری کے لیے رقص و سرور کے علاوہ داستان سنا بھی ایک بہترین مشغلہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے داستان گو ایک کہانی میں بہت سی کہانیاں شامل کر کے داستان کو طول دینے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن ہر کہانی بنیادی قصے کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ باتوں سے بات اس طرح پیدا کی جاتی تھی کہ سننے والوں کو بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ دراصل داستان گو سامعین کے اشتیاق اور دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے قصے میں قصہ جوڑتا جاتا تھا۔ داستان امیر حمزہ۔ بوستان خیال۔ الف لیلیٰ فسانہ عجائب اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

پلاٹ:

جہاں تک داستان کے پلاٹ کی بات ہے طوالت بے ربطی اور پیچیدگی کی موجودگی میں داستان سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں کوئی مربوط پلاٹ ہو گا ایک عجیب سی بات لگتی ہے۔ داستان میں ایک بے ترتیب اور بے قاعدہ پلاٹ ہوتا ہے۔ جسے داستان گو کہانی کے ساتھ ساتھ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ داستان کے پلاٹ کی بے ربطی اس ماحول کی پیداوار ہے جس میں داستانیں لکھی گئیں وہاں داستان گو کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وقت کتنا گزر گیا اور نہ ہی سامعین کو اس کی کوئی پروا تھی۔ لیکن بعض داستانوں میں سادہ قصہ بھی ملتا ہے۔ سب رس کا پلاٹ دوسری داستانوں کے مقابلے میں زیادہ مربوط ہے اور اس میں ابتداء سے آخر تک ایک ہی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح فسانہ عجائب کا پلاٹ دوسری داستانوں کی طرح نہ تو غیر مربوط ہے اور نہ ہی پیچیدہ ان میں وحدت اور تسلسل دونوں موجود ہیں۔ لیکن بہر حال زیادہ تر داستان میں غیر مربوط پلاٹ ہی پایا جاتا ہے۔

کردار:

داستانوں کے کردار ناول اور افسانوں کے مقابلے میں بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ یہ ہے کہ سبھی داستانوں میں کردار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ داستانوں میں دو طرح کے کردار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خیر کی نمائندگی کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو جنگ و جدال اور شر میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کرداروں میں انسانی فطرت کی طرح تبدیلی کا عنصر موجود نہیں ہوتا بلکہ ابتدا تا آخر یکسانیت رہتی ہے۔ داستان کا مرکزی کردار یعنی شہزادہ تمام صفات کا مالک ہوتا ہے۔ خوبرو اور دانش مند تمام طلسمات توڑنے کی طاقت رکھتا ہے یہی صورت شہزادی کی ہوتی ہے۔ ناز و نعم میں پلی اتنی نازک کو غیر مرد کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جائے۔ خیر کی نمائندگی کرنے والے تمام کردار انتہائی متقی اور پرہیز گار دکھائے جاتے ہیں۔ داستان کے برے کردار میں دنیا کی تمام برائیاں موجود ہوتی ہیں یہ سب شہزادے کے منزل تک پہنچنے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں کبھی جادو کے ذریعے یا کبھی براہ راست جنگ کر کے شہزادے کو مات دینا چاہتے ہیں۔ ان برے کرداروں میں انسان کے ساتھ ساتھ دیو اور جنات وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ داستان میں عام طور پر کرداروں کے نام علامتی رکھے جاتے ہیں۔ باغ و بہار میں چار درویشوں، آزار بخت کے علاوہ خواجہ سگ پرست کے کردار ناقابل فراموش ہیں۔ اس کے علاوہ مرکزی کردار کے کچھ معاون مزاحیہ کردار بھی ہوتے ہیں جیسے داستان امیر حمزہ میں عمرو عیار کا کردار بات بات پر مضحکہ خیز کلمات کہہ کر کے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

مافوق الفطرت عناصر:

داستان کی دنیا عام دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں عجیب و غریب قسم کی مخلوق دکھائی دیتی ہے۔ یہاں دیو جن اور پریاں ہوتی ہیں۔ نجومی جوتشی اور جادوگر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ طلسمات کا جال بچھا ہوتا ہے یعنی داستان کو دلچسپ بنانے اور اس میں حیرت انگیز فضا پیدا کرنے کے لیے مافوق الفطرت عناصر کو شامل کیا جاتے ہیں۔ عام زندگی کے واقعات کو سننے سے سامعین لطف اندوز نہیں ہوتے وہ غیر فطری واقعات کی داستان گو سے توقع رکھتے ہیں اس لیے داستان میں غیر فطری عناصر کا بیان کر کے سامعین کا اشتیاق بڑھایا جاتا ہے۔ آج کے مقابلے میں پچھلی صدیوں کے لوگ توہم پرست لوگ تھے۔ جن کو جن پریوں اور جادو پر پختہ یقین تھا۔ اس لیے ہر ملک کے ابتدائی ادب میں مافوق الطفرت عناصر ملتے ہیں۔ داستانوں میں فوالفطرت کرداروں کی شمولیت گراں نہیں گزرتی بلکہ اس سے دلچسپی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اردو کی طویل داستانوں داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال میں جابجا جادوئی کردار نظر آتے ہیں۔

منظر نگاری

داستان کی طوالت کا انحصار منظر نگاری میں مہارت رکھنے پر بھی ہے۔ اس لیے داستانوں میں بہترین مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ جس کو داستان گو فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین قدرتی مناظر سے مالا مال ہے یہاں اونچے پہاڑ اور سرسبز و شاداب میدان و باغات کے ساتھ ساتھ صحرا بھی موجود ہے۔ داستانوں میں ان سب کا عکس نظر آتا ہے۔ گذشتہ زمانے میں کسی نہ کسی بہانے جشن کا انعقاد ہوتا تھا جس میں رقص و سرور کا سامان مہیا ہوتا تھا۔ ان تقریبات کی خوبصورت منظر کشی بھی داستان میں کی گئی ہے۔ باغ و بہار میں مکمل جزئیات کے ساتھ مناظر پیش کیے گئے ہیں۔

اسلوب:

یوں تو داستان سنے سنانے کا فن ہے لیکن اس زبانی بیان کا انداز بھی عام گفتگو سے مختلف ہوتا تھا۔ اس لیے جب تحریر کا فن آیا اور داستانیں لکھی جانے لگیں تو اس کا انداز بھی عام تحریر سے مختلف رہا۔ داستانوں میں عام طور پر دو طرح کے اسلوب اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک پر شکوہ اور دوسرا سلیس اور سادہ۔ کوئی بھی داستان عام طور پر اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم نہیں ہوتی بلکہ اسے اہم بناتا ہے اس کا اسلوب۔ واقعات کی ترتیب اور جزئیات کا بیان۔ سب رس سے لے کر باغ و بہار تک ہر داستان اسلوب کے حوالے سے اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ سب رس کا اسلوب مقفیٰ اور مسجع ہے لیکن وہاں بھی سلاست موجود ہے، جبکہ باغ و بہار کا اسلوب سادہ اور سلیس جس میں عوامی زبان کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جس میں روزمرہ اور محاورے کی چاشنی موجود ہے۔ اس طرح فسانہ عجائب کا اسلوب نہایت مشکل پر شکوہ اور منفرد ہے۔ اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ اسی طرح سبھی داستانیں اپنے مخصوص اسلوب کے سبب پہنچانی جاتی ہیں اور یہی اس کی سب سے بڑی شناخت بنتا ہے۔

ارتقاء

دنیا کی کوئی زبان بھی داستانوں کے ذخیرے سے خالی نہیں ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح عربی اور فارسی کے قدیم لٹریچر بھی داستانوں کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اردو زبان و شاعری کی طرح اردو داستان کا بھی عربی اور فارسی داستان سے گہرا تعلق ہے۔ ادب کے دکنی دور میں متعدد داستانیں لکھی گئیں مگر ان میں سے بیشتر منظوم تھیں۔ ویسے تو ملا وجہی نے تصنیف "سب رس" کو بھی داستان قرار دیا ہے۔ لیکن حسین عطا خان تحسین کی "نوطرز مرصع "۱۷۷۵ء کو اردو کی پہلی اور باقاعدہ نثری داستان مانا گیا ہے۔ جو کہ فارسی ترجمہ کی گئی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام کئی داستان تحریر کی گئی گئیں جن میں حیدر بخش حیدر کی آرائش محفل اور توتا کہانی، خلیل خان اشک کی "داستانِ امیر حمزہ"، مظہر علی ولا کی "ہفت گلشن" اور میر امن کی "باغ و بہار" شامل ہے۔ ان داستانوں کے علاوہ "رانی کیتکی کی کہانی" انشاء ۱۸۰۳، ہفت گلشن (مہجور) رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب "۱۸۲۵، بوستان خیال از خواجہ بدر الدین امان جبکہ طلسم ہوش ربا اور سروشِ سخن (فخر الدین سخن دہلوی) کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر داستانیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ "فسانہ عجائب" البتہ پہلی طبع زاد داستان ہے۔

میر امن دہلوی

میر امن کا اصل نام میر محمد امان اور تخلص امن تھا۔ با قاعدہ شاعری کبھی نہیں کی۔ میر امن کے بزرگ ہمایون کے عہد میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہوئے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔ اس کے بعد میر امن دلی کو خیر آباد کہہ کر عظیم آباد پہنچے۔ وہاں سے کلکتہ گئے کچھ دن بیکاری میں گزرے۔ بالآخر میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی کے سربراہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے کرایا۔ انہوں نے میر امن کو کالج میں ملازم رکھ لیا۔ اور قصہ چہار درویش (فارسی) سلیس نثر میں لکھنے پر مامور کیا۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں باغ و بہار لکھنی شروع کی۔ ۱۸۰۲ میں مکمل ہوئی اور ۱۸۰۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ میر امن کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے۔ میر امن کی زندگی کے حالات کسی کتاب یا تذکرہ میں نہیں ملتے لہٰذا ان کی ولادت اور وفات کے بارے میں کسی کو صحت کے ساتھ معلوم نہیں۔

باغ و بہار

باغ و بہار فورٹ ولیم کالج کی دین ہے جو انگریزوں کو مقامی زبانوں سے آشنا کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ میر امن نے باغ و بہار جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر میر حسین عطا تحسین کی نو طرز مرصع سے ترجمہ کی۔ اور اس طرح یہ داستان اردو نثر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اردو نثر میں پہلی مرتبہ سلیس اور آسان عبارت کا رواج ہوا جو اِسی داستان کی وجہ سے ممکن ہوا۔ آگے چل کر غالب کی نثر نے اس کمال تک پہنچا دیا۔ اس لئے تو مولوی عبد الحق کا کہنا ہے کہ اردو نثر کی ان چند کتابوں میں باغ و بہار کو شمار کیا جاتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں اور شوق سے پڑھی جائیں گی۔

اسلوب:

داستانوں میں جو قبول عام باغ و بہار کے حصے میں آیا ہے۔ وہ اردو کی کسی اور داستان کو نصیب نہیں ہوا۔ عوام اور خواص دونوں میں یہ داستان آج بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی آج سے پونے دو سو برس پہلے تھی۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا دلکش اور دلنشین انداز بیان ہے۔ جو اسے اردو زبان میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ میر امن دہلی کے رہنے والے ہیں اور اُن کی زبان ٹھیٹھ دہلی کی زبان ہے۔ میر امن نے اپنی زبان میں روزمرہ اور محاورے کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

معاشرت کی عکاسی

باغ و بہار کے دیباچے میں انہوں نے اپنے تئیں "دلی کا روڑا لکھا ہے۔ انہیں دہلی والا ہونے پر بڑا فخر ہے۔ اس لئے میر امن کی باغ و بہار میں دہلوی تہذیب معاشرت کی مرقع کشی اس خوبصورت اور دلکش پیرائے میں کی گئی ہے کہ اس کے آئینے میں اُس کا دور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں اس عہد کی دلی کے اشخاص اور افراد کی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کہانی میں دور محمد شاہی کی پوری تہذیب و ثقافت تمام تر معاشرتی اقدار کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لوگوں کا رہن سہن مختلف تہواروں، مروجہ کھانے، لباس اور تکلفات کی مکمل تصویر کشی اس داستان کا بنیادی خاصہ ہے۔

کردار

باغ و بہار میں یوں تو بے شمار کردار موجود ہیں لیکن بنیادی اور مرکزی مردانہ کرداروں میں پہلا درویش دوسرا درویش، تیسرا درویش، چوتھا درویش، آزار بخت، خواجہ سگ پرست شامل ہیں جبکہ شہزادہ فرنگ کا کوکا، بہزاد خاں سپاہی، مبارک حبشی، ملک صادق اس کردار کے ضمنی کردار ہیں۔ سبز پوش بزرگ، ملک شہ پال اور جنات اور پریوں کے کردار اس داستان کے مافوق الفطرت کردار ہیں۔ جبکہ زنانہ کرداروں میں بصرہ کی شہزادی، ماہ روح، وزیر زادی اور سراندیپ کی شہزادی شامل ہے۔ میر امن کے کرداروں کے ضمن میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ ان کے مردانہ کرداروں کے مقابلہ میں نسوانی کردار زیادہ جان دار ہیں۔ سید وقار

عظیم میر امن کے نسوانی کرداروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ، "کردار نگاری کے معاملہ میں میر امن نے جو توجہ ہر داستان میں ہیروئن پر صرف کی ہے، اس سے مردوں کے کردار محروم رہے ہیں۔"

ناول

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے جو لاطینی لفظ نوس سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب ہے نئی چیز۔ روم کے قدیم بادشاہوں کے نئے احکامات کو ناوے لاس کہا جاتا تھا۔ انگریزی میں رومانس یعنی داستانوں صنف کے بعد جب ایک نئی صنف وجود میں آئی تو اسے ناول یا نیا کا نام دیا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ناول کے اشخاص قصہ اور پلاٹ ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف یعنی نئے ہوتے ہیں۔ ناول صنعتی عہد کی پیداوار ہے۔ جب سائنس نے ترقی کی اور بہت سے تواہمات باطل قرار پائے تو داستانوں کی جگہ ایک نئے صنف ادب کو عروج حاصل ہوا۔ داستانوں میں جو قصے بیان ہوتے تھے ان میں مافوق الفطرت کردار ہوتے تھے۔ جس کو نئے انسان کے لیے تسلیم کرنا اور ماننا بڑا مشکل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کی ابتداء ہوئی۔

ناول کے بارے میں ای ایم فاسٹر لکھتے ہیں۔

ایک خاص طوالت کا نثری قصہ ناول ہے

ہنری جیمینز

ناول اپنے وسیع ترین تعریف میں زندگی کا شخصی اور راست مطالعہ ہے

پروفیسر بیکر کا کہنا ہے۔

ناول میں زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ایک سائنٹفک فلسفیانہ یا کم از کم ذہنی تنقید حیات ہوتی ہے۔ یہ نثر میں ہوتی ہے اس میں حقیقی زندگی کی ہو بہو یا اس سے مشابہ تصویر ملتی ہے۔ ناول کے واقعات مربوط ہوتے ہیں۔

اجزائے ترکیبی

کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، ماحول، نکتہ نظر، تکنیک اور اسلوب

کہانی:

ناول کا سب سے اہم جزو کہانی یا قصہ ہے۔ عام طور پر ناول کو ایک قصہ ہی سمجھا جاتا ہے اور عام ناول میں قصے کے سوا کچھ ہوتا بھی نہیں ہے لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ ناول بھی قصے کے بغیر تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ ناول کے ممتاز نقاد ای ایم فاسٹر نے کہانی کو ناول کی ریڑھ کی ہڈی قرار دیا ہے جس طرح ریڑھ کی ہڈی کے بغیر انسان چلنے پھرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اسی طرح کہانی کے بغیر ناول کا تصور ناممکن ہے۔ کہانی سننا اور اس سے لطف ہونا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان ہمیشہ سے ہی کہانی میں دلچسپی لیتا آیا ہے۔ کہانی میں وقت کے حساب سے ترتیب ضروری ہے ہماری زندگی میں ہر بات ایک وقت میں نہیں ہوتی اس لیے ہر کہانی میں اوقات کا تعین اور ترتیب ضروری ہے۔ دلچسپی اور تجسس بھی کہانی کے لیے بہت ضروری ہے۔ کچھ قصے دلچسپ ہوتے ہیں اور کچھ غیر دلچسپ۔ قصے کی خوبی یہ ہے

کہ اس سننسنے یا پڑھنے والا ہمیشہ اس دھن میں لگا رہے کہ آگے کیا ہو گا ہر قصہ گو اپنے اپنے اندار میں قصہ بیان کر تا ہے۔ لیکن قصے کو دلچسپ بنانے کا فن سب کو نہیں۔ اچھا قصہ وہی تصور کیا جاتا ہے جس کو سننے یا پڑھنے سے مسرت حاصل ہو۔ قصہ یوں تو ہر افسانوی صنف میں بیان کیا جاتا ہے لیکن ناول میں کہانی پر خصوصی محنت پر کی جاتی ہے۔ جب کہ افسانے کے مقابلے میں ناول میں کہانی کو طول دینا بھی ممکن ہو تا ہے۔

پلاٹ

واقعات کے منطقی ترتیب کا نام پلاٹ ہے۔ پلاٹ کو ایک طرح سے فن تعمیر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اچھے پلاٹ والے ناول کا ہر حصہ اس طرح تعمیر ہو تا ہے جیسے کسی عمارت کے الگ الگ حصے۔ عام طور پر پلاٹ ایک سیدے سادے پلاٹ کے پانچ حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے میں تمام کرداروں کا تعارف ہو جاتاہے دوسرے حصے میں ان کرداروں کے معاملات میں گھتیاں پڑھنی شروع ہو جاتی ہے تیرے حسے میں یہ گھتیاں الجھ جاتی ہی کہ ان کا سلجھنا مشکل نظر آتا ہےں جب کہ چوتھے حصے میں یہ سبھی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں اور پانچویں حصے میں تمام معاملات خاتمے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ناول کی عمدگی کا انحصار بڑی حد تک پلاٹ پر ہی ہو تا ہے۔

کردار:

کوئی بھی کہانی کرداروں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ ناول معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اس میں ہر طرح کے کرداروں کی موجودگی لازمی ہے۔ ان کے افعال واعمال اور عمل ردِ عمل سے ہی ناول کی تشکیل ہو گی۔ ایک یا دو کردار نسبتاً اہم ہوتے ہیں۔ جنہیں مرکزی کردار کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ناول میں قدم قدم پر ضمنی کردار ملتے ہیں۔ کرداروں کو نہ تو جامد ہونا چاہیے اور نہ بے لچک۔ یک رُخے کردار بے جان ہوتے ہین۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے افعال و اعمال حرکات وسکنات، بول چال اور عادات واطوار معاشرے کے عام انسانوں جیسے ہوں۔ ورنہ وہ قارئین کو متاثر نہیں کر سکیں گے۔ کردار کی نیکی بدی کامیابی و ناکامی، حسن وبدصورتی اور شجاعت وبزدلی وغیرہ میں توازن اور تناسب ضروری ہے تاکہ ناول بے کیفی اور بیرنگی کا شکار نہ ہو۔

انداز نظر:

کچھ ناول نگار اصلاحی مقاصد کے لیے ناول لکھتے ہیں۔ بعض صرف تفریح کو مد نظر رکھتے ہیں۔ اچھے ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی خاص نقطہ نظر کو اس فنکاری کے ساتھ پیش کیا جائے کہ ناول کی ادبی اور فنی سطح بر قرار رہے۔ تبلیغی اور اصلاحی تقاضوں کو فنی پہلو پر غالب کر دینے سے ناول کا معیار گر جائے گا۔

زبان وبیان:

ناول کی تشکیل وتعمیر میں ناول نگار کی زبان، اندازِ تحریر اور اسلوب بڑے اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ فنی اعتبار سے ناول نگاری کی کامیابی اس بات پر ہے کہ وہ کس قسم کے الفاظ وتراکیب استعمال کرتا ہے۔ اس کی تشبیہات اور تمثیلات کا کیا انداز ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت کیسی ہے۔ پھر یہ کہ مختلف کرداروں کی گفتگو کیسی ہے۔ یہ سب چیزیں ناول کی فنی عظمت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

منظر نگاری:

داستانوں کی طرح ناول میں بھی منظر نگاری کے رنگارنگ مرقعے ملتے ہیں۔ اچھا ناول نگار قدرتی مناظر کے مختلف واقعات کے پس منظر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مناظر کی رنگینی ودلکشی سے بعض اوقات کہانی میں تنوع پیدا کیا جاتا ہے۔ قدرتی مناظر کے علاوہ معاشرتی تقاریب اور مختلف مواقع کے تفصیلی نقشے بھی ناول کی رنگارنگی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ناول کی اقسام۔

کرداری ناول:۔ جس ناول میں کہانی ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہو اس کو کرداری ناول کہا جاتا ہے۔

ڈرامائی ناول: ڈرمائی ناول میں واقعات کی رو تیز ہوتی ہے۔ اس میں تبدیلی اتنی تیزی سے نمودار ہوتی ہے کہ قاری اس میں ڈرامائیت محسوس کرتا ہے۔

مہماتی ناول: اس قسم کے ناول میں ہر نئی مہمات سامنے آتی ہیں۔ ایسے ناولوں میں ناول نگار قارئین کو نئی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔
واقعاتی ناول: ایسے ناول جن میں واقعات کی بھرمار ہو اور کرداروں کے بجائے ڈھیلی ڈھالی قصہ گوئی پر زور دیا گیا ہو، واقعاتی ناول کہلاتے ہیں۔
نظریاتی ناول: ناول نگار بعض اوقات خاص نظریے کو ناول کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ اس قسم کے ناول کو فکری یا نظریاتی ناول کہتے ہیں۔
تاریخی ناول: تاریخی ناولوں میں تریک کے کسی دور کو پس منظر کے دور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات تاریخی کردار بھی سامنے آتے ہیں۔
جاسوسی ناول: جاسوسی ناول کی بنیاد تجسس،، تحیر اور اضطراب پر ہوتی ہے۔
اصلاحی ناول: معاشرتی اصلاح کو پیش نظر رکھ کر جو ناول لکھا جاتا ہے اس کو اصلاحی ناول کہا جاتا ہے۔

ارتقاء:

اردو میں ڈپٹی نذیر احمد سب سے پہلے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ اُن کا ناول "مراۃ العروس" اُردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "بنات النعش"، "ابن الوقت"، توبتہ النصوح" اور "فسانہ مبلتا" نذیر احمد کے معروف ناول ہے۔ انھوں نے ناول کو معاشرتی اصلاح کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ رتن ناتھ سرشار نے ناول لکھے لیکن فسانہ آزاد ان کا شاہکار ہے۔ جس میں لکھنو تہذیب کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ اردو میں عبدالحلیم شرر تاریخی ناول کے بانی ہیں۔ فردوس بریں ان کا شہر آفاق ناول ہے۔ مرزاہادی رسوکا ناول "امراؤجان ادا" فنی اعتبار سے ایک بلند پایہ ناول ہے یہ لکھنو کی ایک طوائف کی کہانی ہے۔ جس میں خوبصورت کردار نگاری کے ذریعے سے لکھنو کے زوال یافتہ معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔
راشد الخیری نے اپنے ناولوں کے ذریعے سے عورت کی مظلومیت کو جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ پریم چند اُردو ناول نگاروں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند سوچ کے تحت کچلے ہوئے طبقات کے مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں میں کرشن چندر کا شکست، عصمت چغتائی کا ٹیڑھی لکیر اور عزیز احمد کے گریز، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ، شبنم اور ہوس جیسے ناول مشہور ہوئے۔
جدید لکھنے والوں میں شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی"، "قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا"، احسن فاروقی کا "سنگم"، شام اودھ"، خدیجہ مستور کا "آنگن"، رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا"، عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں"، فضل کریم احمد فضلی کا "خون جگر ہونے تک"، ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، غلام الثقلین نقوی کا "میرا گاؤں"، انتظار حسین کا "بستی"، اور بانو قدسیہ "راجہ گدھ" جیسے ناول فنی و فکری لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمد ۶ دسمبر ۱۸۳۶ کو ضلع بجنور کے ایک گاؤں ریہڑ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بطور مدرس عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر بنے۔ ۱۸۸۳ میں ریٹائرمنٹ لے لی اور باقی ماندہ زندگی دہلی میں رہ کر تصنیف و تالیف میں گزاری۔ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو دہلی میں وفات پائی۔

ناول نگاری:

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کی بنیاد روزمرہ زندگی کے حالات و واقعات پر رکھی۔ اور ناول نگاری کو اخلاقی و معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا اور مجلسی زندگی کا ایک مثالی نمونہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے بیشتر کتابیں اپنی لڑکیوں کے مطالعہ کے لیے لکھیں اور ان میں کرداروں کی مناسبت سے ہو بہو زنانہ زبان، گھریلو روزمرہ اور محاورے، زنانہ انداز بیان اور ٹھیٹ زبان استعمال کی۔ اس کے علاوہ وہ صحیح سلیس اور روزمرہ کے مطابق دہلی کی بہترین زبان لکھتے ہیں۔

ان کے اسلوب بیان کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا ظریفانہ انداز بھی ہے۔ لیکن یہ رنگ اعتدال کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ مولانا چونکہ علی گڑھ تحریک کے سرگرم رکن رہے اس لیے ان کی تحریروں پر مقصدیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرے کے مثالی کرداروں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اکثر کردار اسم بامسمیٰ ہوتے ہیں جیسے مزار ظاہر دار بیگ ایک مفلس شخص ہونے کے باوجود لوگوں کے سامنے خود کو امیر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کلیم بہت اچھی گفتگو کرنے والا ہے۔ مقصد کی ترویج کے لیے انہوں نے اپنے ناولوں میں خطیبانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ یہی واعظانہ انداز ان کی ناول نگاری کی بڑی خامی تصور کی جاتی ہے۔

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور ۱۱؍دسمبر ۱۹۲۷ بریلی میں پیدا ہوئیں۔ لیکن تقسیم ہند سے قبل ہی ان کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ انہوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ پہلا ناول "آنگن" ۱۹۶۲ میں اور دوسرا ناول "زمین" ۱۹۸۲ منظر عام پر آیا۔ انہوں نے اپنے ماحول کی حقیقت پسندانہ اور معنی خیز عکاسی کی ہے۔ "آنگن" کا بنیادی موضوع ہندوستانی معاشرے کی گھریلو زندگی پر سیاسی اثرات ہیں۔ مصنفہ نے ایک متوسط طبقے کی عکاسی کی ہے جو ملکی سیاست گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے تباہی کے دہانے پر آن کھڑا ہوا ہے۔ "آنگن" کے مرد سے است کی خاطر گھر بار سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ وہ سے اسی تحریکوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ خانگی جھگڑے اور رشتے ناتے میں ان کا ذکر بھی اس ناول میں ملتا ہے۔

ناول "آنگن" ایک ایسی علامت نظر آتا ہے جو اپنے اندر اس زمانے کی بھرپور جدوجہد کے اثرات علامتی انداز میں سمیٹے ہوئے ہے۔ چچا کا "آنگن" صرف گھریلو زندگی کی عکاسی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے یہ اس دور کی حالت کو بیان کرتا ہے جو دوسری جنگِ عظیم سے تعلق رکھتی تھی۔ ملک کی سیاست نے گھریلو زندگی پر ایسا اثر ڈالا کہ خاندان کے خاندان سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے اور ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد مختلف نظریات کے پابند ہو جانے کے باعث ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔

آنگن میں ان کی ترقی پسندیت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے سماجی زندگی کے مسائل کی اچھی اور بہترین عکاسی کی ہے۔ وہ ناولوں کی بنیاد مادی حقائق اور سماجی شعور پر قائم کرتی ہیں۔ انہوں نے براہِ راست زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں غور و فکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کو افراد کے سماجی تناظر میں پیش کیا ہے۔ خدیجہ مستور کی سادگی میں پرکاری ہے۔ انھوں نے دیگر ناول نگاروں کی طرح اپنے کرداروں کو پیش کرنے کے لیے مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہانی کے مناظر، مکالمے اور کرداروں کے عمل کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا۔ جس میں قاری بھی خدیجہ مستور کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ خدیجہ مستور کے دونوں ناول ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کے ناول اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہادی رسوا

مرزا محمد ہادی رسوا ۱۸۵۷ء کو، ایک گھڑسوار، فوجی افسر، مرزا محمد تقی کے گھر لکھنؤ، اترپردیش میں پیدا ہوئے۔ مرزا محمد ہادی رسوا صاحب کا وصال یہیں حیدرآباد دکن میں ۱۹۳۱ء میں ہوا مرزا ہادی رسوا ؔ کی شخصیت اپنے زمانے کے ادیب و شعراء میں بہت اونچی اور منفرد نظر آتی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ مرزا کی فطرت میں تحقیق کا مادہ زیادہ تھا۔ مرزا کا رجحان ادب سے زیادہ دوسرے علوم وفنون میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ریاضی داں، علم نجوم، منطق وفلسفہ کے ماہر اور حدیث وفقہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ ان تمام کے علاوہ ایک اور خصوصیت یہ کہ وہ ایک سائنسداں بھی تھے۔ تحقیق کرنا مرزا کی عادت ہوگئی جس کی وجہ سے تجربات ومشاہدات بھی وسیع ہوگئے تھے۔ اس لئے ہر چیز کو نہایت گہری نظر سے دیکھا کرتے۔ مرزا اپنی تعلیم، جستجو کو قائم رکھا گھر بیٹھے پرائیوٹ امتحانات دے کر پنجاب یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ پھر امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ علم کے شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا نے مختلف زبانوں یعنی عربی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی اور سنسکرت پر اچھا خاصا عبور حاصل کیا تھا (مختصر تاریخ ادب اردو ۲۴۳)

ادب کی طرف مرزا کا رجحان بہت ہی کم تھا۔ ناول لکھنا ان کا مقصد نہ تھا۔ صرف اصول مقصد تھا۔ علم کی پیاس بجھانے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ جس کی مرزا کے پاس کمی رہی۔ اسی لئے وہ ادب کی طرف قائل ہوئے اور "امراؤ جان ادا" لکھ کر اردو ادب پر فتح پالی۔ یہ بھی قسمت کی عجیب ستم ظریفی رہی کہ جس علم کا مرزا کو شوق تھا اور جس کا حاصل کرنا مقصد زندگی رہا وہ ان کی شہرت کا باعث نہ بن سکا مگر اس کے برخلاف آج مرزا کو زندہ جاوید بنانے والی ان کی ناول نگاری ہے۔ "امراؤ جان ادا" مرزا ہادی کا وہ شاہکار ہے جسے اردو ناول کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور یہ ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم موڑ، ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا نے دوسرے ناول بھی لکھے مگر جو انفرادیت وخصوصیت اس میں نظر آتی ہے وہ نہ صرف ان کی اپنی ناولوں میں بلکہ اردو کے تمام ناولوں میں ممتاز اور نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی خاص وجہ اس میں سادگی، زور بیاں، اختصار اور فطری انداز، انسانی نفسیات کا مطالعہ اور کردار کی جامعیت نظر آتی ہے۔ نہ ہی اس میں کوئی پر اسرار کہانی ہے، نہ جاسوسیت اور نہ محبت بھری داستان بلکہ یہ ناول ایک طوائف کی زندگی کا احوال ہے جس کو مرزا نے خود اس کی زبانی بیان کروایا۔ یہ ایک طوائف کی داستان ہی نہیں بلکہ اپنے محدود آئینہ میں اس عہد کی پوری تہذیب اور معاشرے کی تصویریں سامنے آجاتی ہے۔ مرزا نے بیباکانہ انداز میں بہترین ترجمانی کی ہے۔

"امراؤ جان ادا" رسوا کے تخیلی کردار کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ مرزا کے قلم نے اس کو حقیقت کا روپ دینے میں کوئی کمی نہ کی۔ مرزا کو لکھنؤ کی صاف ستھری اور وہاں کی مخصوص روزمرہ زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور اس کے ساتھ ان کے تخیل کی بلندی گہرے مطالعہ نے ان کو ادب کا مرکز بنادیا جس کی بدولت لکھنؤ کی ادبی وعلمی فضا میں ایک نئی روح پھونک دی، اس ناول کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہ ہےکہ اس میں انسانی نفسیات کا ماہرانہ تجزیہ ہے۔ اس داستان میں اداؔ سے بجائے نفرت کے ایک ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے اور اسکا تعارف ایک تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، شاعرہ کی حیثیت سے ہوتا ہے جسے زمانے کے اتار چڑھاؤ نے یہ دن دکھائے۔

کبھی کبھی تبصرے اس قدر جامع اور بہترین ہوتے ہیں کہ بے اختیار زبان سے واہ نکل جاتا ہے اور تبصرہ نگار کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ناول "امراؤجان ادا" پر عبدالماجد دریابادی کا بھی تبصرہ کچھ اس طرح کا ہے۔ کہتے ہیں "مرزاہادی، رسوا ہو کر بھی آخر تک ہادی ہی رہے"۔

افسانہ

دورِ جدید میں انسان کی مصروفیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا اثر زندگی کے تمام شعبوں کی طرح ادب پر بھی پڑا ہے۔ گوناگوں مصروفیات میں گھرے ہوئے انسان کا تقاضا یہ ہے اس کوئی ایسی چیز پڑھنے کو ملے جو نہایت مختصر وقت میں اس کے ذوق کی تسکین و تشفی اور اس کے جذباتی، نفسیاتی اور تفریحی تقاضوں کو پورا کر سکے، مختصر افسانے اس ضرورت کی پیداوار ہے۔ افسانہ (یا مختصر افسانہ) قصہ کہانی کی وہ شکل ہے جس کے لیے انگریزی میں Short Story کا نام استعمال ہوتا ہے۔ یہ داستان اور ناول کی ارتقائی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ افسانہ کی جامع تعریف آسان نہیں۔ کیونکہ اس کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں۔

فنی لحاظ سے افسانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحدتِ تاثر کا حامل ہو۔ وحدتِ تاثر پیدا کرنے کے لیے ایک معیاری افسانے میں صرف ایک مقصد پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر مقاصد ایک سے زیادہ ہوں تو افسانے میں بہت سی فنی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، افسانے میں تاثر کی وحدت اور اتحاد قائم رہے تو اس کی طوالت بھی گراں نہیں گزرتی ورنہ قاری افسانے میں دلچسپی محسوس نہیں کرتا۔

اختصار افسانے کی بنیادی خوبی ہے۔ بعض نقادوں نے کہا ہے کہ مختصر افسانہ وہ ہے جو نصف گھنٹے میں پڑھا جاسکے۔ بعض کا خیال ہے کہ جو کہانی ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے، اسے افسانہ کہتے ہیں۔ درحقیقت افسانے پر وقت کی قید نہیں لگائی جاسکتی۔ البتہ افسانہ نگار کو غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرنا چاہیے۔ نقادوں نے افسانے کو غزل کے مشابہ قرار دیا ہے، جو بظاہر مختصر مگر معنوی اعتبار سے جامعیت کا شاہ کار ہوتی ہے۔

افسانے کے لیے پلاٹ بھی ضروری ہے، واقعہ یا (واقعات) کا آغاز و ارتقا پھر عروج و منتہا تک پہنچنا اور اس کے بعد ایک موزوں نتیجے پر ختم ہونا۔ اسی ترتیب و تنظیم کا نام پلاٹ ہے۔ ایک اچھے افسانے میں منتہا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ صحیح قسم کے منتہا کی غیر موجودگی سے قاری پر افسانے کا کوئی تاثر قائم نہیں ہوتا۔ منتہا کے بغیر افسانہ ایک بیانیہ مضمون ہوگا۔

رمز و ایما، مختصر افسانے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ غزل کی طرح افسانے میں بھی وضاحت سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ مختصر افسانے میں کوئی واضح آغاز اور انجام نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات افسانے میں کسی واقعے یا کردار کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اور قارئین خود ہی اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

ان بنیادی خصوصیات کے علاوہ افسانے کی فضابندی، کردار کی سیرت کشی، افسانہ نگار کا اسلوب، مکالمے اور افسانے کا عنوان وغیرہ بھی کسی افسانے کے معیار کے سلسلے میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ مندرجہ بالا خصوصیات افسانے کے خدوخال کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس کے باوجود افسانے کی جامع تعری ف اس لیے ممکن نہیں کہ جدید افسانے میں بے شمار تبدیلیاں آچکی ہیں۔ بلند پایہ اور معیاری افسانوں کو سامنے رکھ کر اس کی جو تعریف بھی کی جائے، وہ افسانے کے سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر گرفت میں نہیں لے سکتی۔

افسانہ اور ناول میں فرق:

افسانہ اور ناول کے عناصر ترکیبی میں خاصا اشتراک ہے کیونکہ افسانہ ناول کی ارتقائی شکل ہے۔ مگر درحقیقت دونوں میں بڑا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ نقادوں نے اسے نظم اور غزل کے فرق سے تشبیہ دی ہے۔ بہرحال ناول اور افسانے میں مندرجہ ذیل بنیادی اختلافات ہیں:

۱۔ افسانہ مختصر ہوتا ہے اور ناول طویل۔ افسانے میں کسی کردار کی محض ایک جھلک، ایک جذباتی یا اضطرابی کیفیت پیش کی جاتی ہے۔ مگر ناول میں تفصیل کے کے ساتھ زندگی کی پیچیدگیاں موضوع بنائی جاسکتی ہیں۔

۲۔ افسانہ مختصر ہونے کے سبب ایک خیال، ایک واقعہ، ایک احساس یا ایک تجربے کو پیش کرتا ہے۔ اسی لیے وہ وحدتِ تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ مگر ناول کا کینوس زندگی کی طرح بے حد وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں پھیلاؤ اور وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ناول میں تاثر کی وحدت اور اتحاد قائم نہیں رہتا۔ خیالات و تاثرات کے لحاظ سے افسانے کے برعکس ناول کی رنگارنگی اور رنگینی کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔

۳۔ افسانے میں اختصار کے ساتھ تیز رفتاری بھی ہوتی ہے لیکن افسانہ نگار اس مسافر کی طرح ہوتا ہے، جس کے پاس وقت کم ہو اور مسافت زیادہ ہو۔ اس لیے وہ راستے کی رکاوٹوں کو برق رفتاری سے عبور کرتا، کانٹوں سے دامن بچاتا اور ندیوں کو پھلانگتا، جلد منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۔ افسانے میں ایک ہی پلاٹ ہوتا ہے، لیکن ناول میں مرکزی پلاٹ کے ساتھ ساتھ کئی کئی چھوٹے چھوٹے ضمنی پلاٹ بھی ہوتے ہیں۔ جو مل کر مرکزی پلاٹ کی تکمیل کرتے ہیں۔

۵۔ افسانے کے کردار بالعموم ارتقا سے عاری ہوتے ہیں مگر ناول نگار اپنے کرداروں کی سیرت کو تفصیل سے واضح کرتا ہے۔ افسانے میں ناول کی طرح کرداروں کے خیالات اور مختلف کیفیات کا تفصیلی بیان ممکن نہیں ہو سکتا۔

۶۔ افسانے کی فضا، کردار اور ماحول پر بالعموم مقامی رنگ کا غلبہ ہوتا ہے۔ جبکہ ناول اپنی وسعت کے سبب کسی ایک علاقے خطے یا ملک سے مختص نہیں ہوتا۔ اس میں زمان و مکاں کی آزادی اور آفاقیت پائی جاتی ہے۔

ارتقاء

اردو میں یہ صنف انگریزی سے داخل ہوئی۔ پریم چند کو پہلا افسانہ نگار کہا جاتا ہے جبکہ بعد نقادوں کی نظر میں سجاد حیدر یلدرم پہلے افسانہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے خیال میں راشد الخیری اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں ترقی پسند افکار اور وطن سے محبت کا حوالہ ملتا ہے۔ جب کہ یلدرم پر رومانوی رجحان غالب ہے۔ علی عباس حسینی، سلطان حیدر جوش اور اعظم کریوی وغیرہ نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا جبکہ مجنوں اور نیاز فتح پوری نے یلدرم کے رومانوی انداز کی پیروی کی۔

۱۹۳۰ تک حیات اللہ انصاری، فیاض محمود۔ عظیم بیگ چغتائی اور اختر انصاری جیسے افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ لیکن "انگارے" کی اشاعت اور ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز نے افسانے کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ چنانچہ کرشن چندر، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں پر اس تحریک کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اسی دور میں سعادت حسن منٹو، حسن عسکری، ممتاز شیریں اور بیدی وغیرہ نے بھی بڑے خوبصورت افسانے تحریر کیے۔ چغتائی، منٹو اور عسکری پر فحاشی اور عریاں نگاری کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو نئے افسانہ نگار سامنے آئے ان میں انتظار حسین، غلام عباس، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، ہاجرہ مسرور، اے حمید، شفیق الرحمن، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، واجد، تبسم، بلونت سنگھ اور بانو قدسیہ جیسے تخلیق کار شامل ہیں۔ اردو میں افسانے کو بڑی تیزی سے قبول عام ملا اور اسی نسبت سے افسانے کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہوا۔ دورِ حاضر میں اردو افسانہ فن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے۔

پریم چند

منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۱۳ جولائی ۱۸۸۰ء کو ضلع وارانسی مرٹھوا کے "لمہی" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نے آپ کا نام دھنپت رائے رکھا جبکہ آپ کے چچا نے آپ کا نام پریم چند رکھا۔ ۱۸۸۵ء میں لال پور کے مولوی صاحب کے پاس اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں گورکھپور سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں معلم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ۱۸ روپے ماہوار تنخواہ لیا کرتے تھے۔ بعد ازاں ۱۸۹۹ء میں بنارس میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ ۱۹۰۰ء میں بیرائچ کے گورنمنٹ سکول میں تقرر ہوا اور ہرپرتاب گڑھ کے ضلع میں تبادلہ ہوا۔ الہ آباد میں جاکر آپ نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا۔

۱۹۰۴ء میں جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان پاس کیا اور اسی سال الہ آباد یونیورسٹی سے اردو ہندی کا خصوصی امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۶ء میں آپ کی دوسری شادی ایک بیوہ "شیورانی دیوی" سے ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں ترقی پاکر سب انسپکٹر آف سکولز ہوگئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی۔اے کیا۔ فروری ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں ملازمت سے علیحدہ ہوئے۔ ۱۰ ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں پہلی مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صدارت کی۔ ۱۸ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ۵۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

منشی پریم چند کی ابتدائی ادبی زندگی

آپ کا پہلا ناول "اسرارِ مابعد" رسالہ آوازِ خلق میں ۱۸ ر اکتوبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں دوسرا ناول "کیشنا" کے نام لکھا جو اب موجود نہیں۔ اس کے بعد ۵ افسانوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں آپ نے آزادی، حریت، غلامی اور بغاوت کے موضوعات کو چھیڑا۔ حکومتِ برطانیہ نے اس پر پابندی عائد کر دی۔ چنانچہ گورکھپور کی حکومت نے اس کی تمام نقول حاصل کر کے جلادیں اور آئندہ کے لیے سخت پابندی عائد کر دی۔ پریم چند نے ان افسانوں میں "نواب رائے" کے قلمی نام سے لکھا۔ بعد میں پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا۔

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کے ادوار

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون "پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور" میں ان کی افسانہ نگاری کے چار ادوار بتائے ہیں۔

پہلا دور: ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۹ء تک ابتدائی کوشش

دوسرا دور: ۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۰ء تک تاریخی اور اصلاحی افسانے

تیسرا دور: ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۲ء تک اصلاحی اور سیاسی افسانے

چوتھا دور: ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء تک سیاسی اور فکری افسانے

پریم چند کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج

زندگی کے خارجی معاملات اور معاشرے کی صحیح عکاسی حقیقت نگاری کہلاتی ہے جبکہ رومانیت میں زندگی کے باطنی پہلو اور وجدانی معاملات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس حوالے سے رومانیت میں تخیل کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان کے مطابق "رومانوی ادیب زندگی کی عکاسی ایک مصور کی حیثیت سے کرتا ہے جبکہ حقیقت پسند، زندگی کو فوٹوگرافر کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

پریم چند کے ہاں ہمیں دونوں رویے ملتے ہیں۔ ایک طرف سماج کی سچی اور کھری تصویریں جبکہ دوسری طرف تخیل کی رنگ آمیزی ملتی ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان کی رائے کے مطابق "پریم چند کے ہاں رومانیت کا تصور ایک سماجی پہلو لیے ہوئے ہے اور وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انحراف نہیں کرتے"۔

پریم چند بنیادی طور پر طبقاتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ فرد کی آزادی کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ ان کی رومانیت پر وطن پرستی کا رنگ غالب ہے جس کا اظہار ان کی ابتدائی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پریم چند محبت کا تصور رومانوی اثرات کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق کا اظہار کرنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تصور محبت سماجی روایت سے منسلک ہے۔ جس میں محبت کے کئی رنگ موجود ہیں۔ جس میں حب الوطنی، کچلے ہوئے طبقات سے ہمدردی، مادی حقائق کی اہمیت کو تسلیم کرنا وغیرہ۔

پریم چند کے کردار اکثر معاشرے کے ستائے ہوئے عام لوگ ہیں۔ انھوں نے ان ستائے ہوئے اور کچلے ہوئے مظلوم لوگوں خصوصاً دیہاتوں میں جاگیرداروں اور مہاجنوں کے ظلم کے مارے ہوئے لوگوں کو زبان دی۔ ان کے اندر آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا اور ایک نئی دنیا تعمیر کی اور طبقات سے آزاد معاشرے کا وجود ان کا بنیادی نظریہ تھا۔ وہ مثالیت اور حقیقت کے امتزاج سے اپنی افسانوی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔

پریم چند کا اسلوب

آپ نے اپنے افسانوں میں سادہ زبان استعمال کی۔ آپ نے سنسکرت کے الفاظ کا کم استعمال کیا۔ آپ نے اکثر کرداروں کے مکالمے ان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق لکھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے لیے مکالمے ان کے لہجے اور تلفظ میں تخلیق کیے۔ جو آپ کے زبردست مشاہدے کا غماز ہے۔ آپ نے ہندوستان کے لوگوں کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا۔ اُس وقت جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت موضوعات عروج پر تھے، آپ نے بین الاقوامی، ملکی، علاقائی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ آپ نے ہندوستان کے دیہی موضوعات سے ساتھ ساتھ متوسط شہری کی زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔

(۱) کفن

یہ پریم چند ہی کا نہیں بلکہ اردو ادب کا بھی بہترین افسانہ ہے۔ یہ دو باپ بیٹوں کی کہانی ہے۔ جس میں جوان بہو زچگی کے عمل میں مر جاتی ہے۔ لاش کے لیے کفن نہیں ہوتا۔ دونوں باپ بیٹے کام چور ہوتے ہیں۔ کوئی ان کی مدد کے لیے تیار نہیں ہوتا مگر آخر کار انسانی ہمدردی کے تحت کفن کے لیے پیسے جمع ہو جاتے ہیں۔ دونوں باپ بیٹا کفن لینے نکلتے ہیں اور شراب خانے جا کر سارے پیسے خرچ کر دیتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر محمد حسین "کفن میں پہلی بار پریم چند سماج کی تھوڑی بہت اصلاح کی جگہ اس کے مسلمات پر براہ راست حملہ آور ہوتے ہیں۔۔۔ آخر مردے کے کفن پر پیسہ ضائع کرنے کی بجائے مظلوم انسانوں کو جن کی زندگی جانوروں سے بدتر ہے۔ اس رقم سے دو لمحے بشاط اور خوشی میسر آ جائے تو کیا کفن دینے سے کہیں بہتر کارِ ثواب نہیں ہے"۔

کفن حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فنی جمالیات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ افسانہ ان کے اس نقطۂ نظر کا ترجمان ہے جو انھوں نے اپنے ایک خط میں بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں "محض واقعات کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جب تک اس قسم کی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم نہیں اٹھتا"۔ ۱۹۳۰ء

انھوں نے کفن میں جس جرأت کے ساتھ انسانی فطرت کو بے نقاب کیا ہے وہ ان کے فن کا کمال بھی ہے اور نقطۂ نظر کا اظہار بھی۔ آپ نے "کفن" کے بنیادی کرداروں "گھیسو" اور "مادھو" کے باطن میں گھس کر فطرت کو بے نقاب کیا۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: "پوری کہانی کی جان حالات کی ستم ظریفی ہے۔ جس نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا"۔

طبقاتی نظام میں محکوم اور مجبور لوگوں کا استحصال ان کے اندر انسانی احساسات کو ختم کر دیتا ہے اور ان کو حیوانی سطح پر رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "کفن" کی یہ طنزیہ صورت حال اس دردناک منظر سے شروع ہوتی ہے کہ جھونپڑے کے اندر جواں سال بہو دردِ زہ سے تڑپ رہی ہوتی ہے اور باہر گھیسو اور مادھو بجھے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے خاموشی سے اس کے مرنے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ پریم چند کا کمال یہ ہے کہ وہ کم لفظوں میں بڑی حقیقت کو کہانی کا روپ دیتے ہیں۔

بنیادی طور پر کفن کی کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلے حصے میں کرداروں کا تعارف، دوسرا حصہ بہو کی موت اور اثرات، تیسرا حصہ غربت وافلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے حسی کا اظہار۔

پریم چند نے اردو زبان وادب اور اس کے سرمایہ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انھوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ وہ پہلے ادیب تھے جن کی نظر حیات انسانیت کے انبوہ میں ان مجبور اور بے بس انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء کو لدھیانہ کے قصبہ سمرالہ میں پیدا ہوئے لیکن زندگی کی ناہمواریوں نے انھیں ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء تک ہی مہلت دی یعنی صرف ۴۳ سال کی عمر پائی، اور اس مختصر سی زندگی میں منٹو نے جو شہرت پائی، وہ بہت کم فنکاروں کے حصہ میں آئی ہے۔ نٹو نے ۴۳ سال کی عمر میں ڈھائی سو سے زائد افسانے لکھے، جن میں بیشتر افسانے ان کے کمال فن کا نمونہ اور شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ افسانہ کہنے کے جس خوبصورت اسلوب اور حیرت انگیز انداز سے منٹو واقف تھے، اس ہنر سے منٹو کے کئی ہم عصر اور حریف افسانہ نگار محروم نظر آتے ہیں۔ قیقت یہ ہے کہ منٹو نے اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے حادثات، واقعات اور سانحات سے شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر ہو کر اپنے مشاہدے اور فکر و فن کی گہرائی و گیرائی اور نفسیاتی کیفیات سے اس طرح افسانے کی ساخت تیار کی، جو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ منٹو کے افسانوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کے ہر افسانے کے موضوع، مواد، کردار، واقعات، احساسات اور جذبات میں انفرادیت کا پرتو جھلکتا ہے۔ منٹو کے ایسے افسانوں میں اس کا اسلوب، پلاٹ، کردار اور ٹریٹمنٹ کا جو فنکارانہ برتاؤ نظر آتا ہے، وہ ان افسانوں کو نہ صرف اہم اور منفرد بناتا ہے بلکہ ان موضوعات پر لکھے گئے کئی عالمی شہرت یافتہ افسانوں کی یاد دلاتا ہے۔ منٹو نے صرف جنسی نفسیات پر مبنی افسانے نہیں لکھے، بلکہ غربت، افلاس، استحصال، مزدور، اس کی پیشانی کا پسینہ، غریبی اور امیری کے درمیان کی خلیج، سیاسی بازیگری، سماجی، معاشرتی بکھراؤ، ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتے، فلمی دنیا کی مصنوعی چمک دمک وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر بھی اپنی بہترین فنّی اور فکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ سو کنڈل پاور کا بلب، جانکی، ڈرپوک، رام کھلاون، خالی بوتلیں خالی ڈبّے، سڑک کے کنارے، نیا قانون، ممد بھائی، ممی، نیلم، پیرن، پری، نطفہ، صاحب کرامات، ساڑھے تین آنے، خورشٹ موتری، شادی، وہ لڑکی اور محمودہ وغیرہ یقینا ایسے افسانے ہیں، جو افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

'نیا قانون' ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آیا تھا یہ منٹو کے نمائندہ افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک سیاسی کردار کا افسانہ ہے۔ جس میں منٹو نے منگو کوچوان کے توسط سے اس عہد کی اجتماعی صورت حال پیش کی ہے۔ منگو جو پیشے کے اعتبار سے کوچوان ہے۔ وہ سیدھا سادہ بے وقوف ان پڑھ اور بیحد باتونی ہے، ذہنی طور پر بیدار اور فطرتاً جلد باز ہے۔ مگر ایک عام ان پڑھ آدمی بھی روشن دماغ ہو سکتا ہے صرف ایک ڈگری یافتہ ہی سمجھ دار نہیں ہوتا۔ گویا منٹو کی انسان دوستی اور ہمدردی اور اس کے تئیں خلوص کا یہاں پتہ ملتا ہے۔ بہر حال منگو کوچوان کا کردار افسانے کی جان ہے۔ ایک عام اور بالکل معمولی آدمی میں دلچسپی کے اتنے پہلو پیدا کرنا منٹو کی کردار نگاری کا امتیازی وصف ہے۔ جہاں تک نیا قانون کے پلاٹ کا تعلق ہے، منٹو نے اس کی تمہید، وسط اور انجام میں مکمل آہنگی اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول ابو اللیث صدیقی:

> 'اس افسانے میں منٹو کا کوئی کمزور پہلو نہیں ابھرتا۔ یہ ہماری سیاسی جد وجہد کے دور کا آئینہ ہے جس میں ہماری آرزوئیں، امنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں اور فنی معیار سے بھی ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے مختصر

افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ نہ بکھرا ہوا۔ بات سے بات نکل کر طوالت نہ پیدا ہو جائے۔ مرکزی خیال ایک رہے۔ کردار، واقعات اور مکالمات اسی ایک خیال کو اجاگر کرنے اور تاثر میں شدت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں... یہ بات بھی یہاں پوری طرح واصل ہو گئی ہے کہ کردار صرف ایک ہی ہے۔ (استاد منگو) واقعات اور مکالمات مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے۔ یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار۔"

سعادت حسن منٹو کے قلم سے نکلے ہوئے بہت سے افسانے انسانی جذبات و احساسات کو جھنجھوڑ دینے والے ہیں۔ نیا قانون ان میں سرفہرست ہے۔ افسانہ ایک انسانی المیے کی یاد دلاتا ہے۔ یہ المیہ ہر دور میں رہا ہے اور موجودہ دور میں اس کی شدت مزید آشکارا ہو چکی ہے۔ آج بھی منگو کوچوان جیسے سیدھے سادے معاشرتی اور سیاسی جبر سے ستائے ہوئے لوگ سیاسی و سماجی تبدیلیوں کی آس لگائے دن گن رہے ہیں۔ لیکن وہ جبر ہے کہ ختم نہیں ہوتا۔ منٹو کا فن اس افسانہ میں اپنی پوری تاب ناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

غلام عباس

غلام عباس ۱۷ نومبر ۱۹۰۹ کو مشرقی پنجاب کے اسی مشہور شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیال سنگھ ہائی سکول لاہور سے حاصل کی۔ جماعت نہم میں تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس لیے تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ انہوں نے ۱۹۴۲ میں میٹرک اور ۱۹۴۴ میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

وہ نویں جماعت میں ہی تھے جب انہوں نے اپنی پسندیدہ انگریزی کہانیوں کا اردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ غلام عباس خود کہتے ہیں "میں نے جب پہلا افسانہ لکھا، اس وقت میری عمر ۱۵ سے ۱۶ برس تھی۔ یہ دراصل ٹالسٹائی کے افسانے لانگ ایگزائیل کا ترجمہ تھا۔" بعد ازاں انہوں نے واشنگٹن ارونگ کے افسانوی مجموعے Tales from Alhamra کو الحمرا کے افسانے کے نام سے ترجمہ کیا۔

بچوں کے رسالے پھول اور خواتین کے رسالے تہذیب نسواں کے نائب مدیر بھی رہے۔ ۱۹۳۸ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے اور ریڈیو کے رسالے آواز کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۸ میں ریڈیو پاکستان کے رسالے آہنگ کی ادارت بھی انہیں سونپی گئی۔ ۱۹۴۹ میں بی بی سی لندن سے وابستہ ہوئے اور یہاں سے واپس آکر ۱۹۵۲ میں دوبارہ آہنگ کی ادارت سنبھال لی۔

ترجمے، تالیف اور عالمی ادب سے گہرے شغف کی بنا پر ایوب خاں نے اپنی سوانح حیات کا اردو ترجمہ کرنے کی ذمہ داری بھی عطا کی۔ انہوں نے اس آپ بیتی کا ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام سے کیا۔ غلام عباس یکم نومبر ۱۹۸۲ کو اس فانی جہاں سے رخصت ہوئے۔

غلام عباس کے افسانوی مجموعے جاڑے کی چاندنی، کن رس اور آنندی کے نام سے شائع ہوئے جبکہ گوندنی والا تکیہ، جزیرہ سخن وراں اور دھنک کے نام سے ان کے ناولٹ قارئین اور ناقدین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

غلام عباس نے بھی اگرچہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح تراجم ہی سے ادبی سفر کا آغاز کیا مگر انہوں نے اپنے ہم عصروں کے "مشہور و معروف موضوعات" کو چھونا بھی پسند نہیں کیا۔ انہوں نے رواجی موضوعات مثلاً تقسیم، ہجرت، جنس اور بے رحم منظر نگاری کی بجائے عام آدمی کی زندگی کے گوشے نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

خاص موضوعات اور اہم کرداروں کے ذریعے قاری کو جکڑنے کی بجائے غلام عباس نے عام انسان کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنی کہانیوں کاموضوع بنایا ہے۔ اوور کوٹ کا نوجوان، کتبہ کا شریف حسین، کن رس کا فیاض اور بہروپیہ سادہ زندگی کے پیچیدہ مسائل سے گزرنے والے افراد ہیں جن کی حسرتوں اور محرومیوں کا کوئی شمار نہیں، جو بنیادی ضروریات زندگی کو تاعمر ترستے رہتے ہیں، جنہیں ظاہر داری، تصنع اور بناوٹ کی عادت پڑ چکی ہے، جن کی زندگی جہد مسلسل اور سعی ناکام سے عبارت ہے، جو زندگی بھر اپنی ضروریات کی چادر اور خواہشات کے پاؤں پھیلانے میں توازن قائم کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور آخر میں شریف کلرک کی طرح اپنے مکان پر اپنے نام کی تختی تو نہیں لگا سکتے مگر وہی تختی کچھ ترامیم اور اضافوں کے بعد ان کا کتبہ ضرور بنا دی جاتی ہے۔

نظریہ فن کے حوالے سے غلام عباس بہت واضح موقف رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ پریم چند کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے متاثر تو بہت کیا مگر بعد میں اس کے ہاں آرٹ کم اور صلاح زیادہ گئی۔ وہ سنسنی خیزی، مہم جوئی اور فقرے بازی کے قائل نہیں تھے۔ کسی خاص نقطہ نظر کو مد نظر رکھ کر اس کی تشہیر یا پرچار کرنے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ وہ افسانے میں کہانی پن کے قائل تھے۔ ایسی کہانی جس میں ابلاغ آسانی سے ہو جائے۔ وہ عام انسانوں کی زندگی سے کوئی ایسا واقعہ یا پہلو تلاش کر لیتے تھے جو اکثر لوگوں سے چھپا ہوتا تھا۔ جو ان چھوا رہ گیا تھا وہ غلام عباس کے افسانوں کا موضوع بنا اور انہوں نے تقریباً ہر افسانہ ایک مختلف انداز اور تکنیک سے لکھا۔ ان کے تمام افسانے خواہ حیرت انگیز نہ ہوں مگر اثر انگیز ضرور ہیں۔ مختصر یہ کہ غلام عباس نے اپنی تخلیقی زندگی میں آنندی، جاڑے کی چاندنی اور کن رس کی صورت میں جو تین افسانوی مجموعے (۴۳ افسانے) اردو ادب کو دیے ہیں، یہ اپنی سادگی، انفرادیت اور اثر آفرینی کی بدولت ہر اعلیٰ سطح کے نصاب اور انتخاب کا حصہ ضرور بنتے رہیں گے۔

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی (۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء تا ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء) پاکستان کے ایک معروف ادیب، شاعر، افسانہ نگار، صحافی، مدیر اور کالم نگار تھے۔ افسانہ اور شاعری میں شہرت پائی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نمایاں مصنفین شمار ہوتا تھا اور اسی وجہ سے دو مرتبہ گرفتار کیے گئے۔ قاسمی صاحب نے طویل عمر پائی اور لگ بھگ نوّے سال کی عمر میں انھوں نے پچاس سے سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

یوں تو احمد ندیم قاسمی مختلف اصناف ادب کی تحقیق اور تخلیق میں مصروف رہے جن میں نظم، غزل، افسانہ، کالم نویسی، بچوں کی کتب، تراجم، تنقید اور ڈرامے وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن زیر نظر مضمون میں صرف ان کے فنِ افسانہ نگاری پر بحث ہو گی۔ اگر چہ کوئی بھی ادبی تخلیقی شخصیت مختلف اصناف کی تخلیق میں اظہار اور موضوعات کے کچھ بنیادی رنگوں کو اہمیت دیتی ہے۔ تاہم ادب کی ایک آدھ صنف ہی ایسی ہوتی ہے جس میں صاحبِ تحریر اپنے تخلیقی یا نفسیاتی پس منظر کے حوالوں سے اظہار کی مناسب سہولت محسوس کرتا ہے۔ لیکن نثری ادب میں افسانہ ہی وہ واحد صنف ہے جس میں ندیم کا قلم جولانیِ طبع کے امکانات روشن کرتا ہے۔۔

احمد ندیم قاسمی کو خصوصی طور پر پنجاب کی دیہاتی زندگی کا عکاس افسانہ نگار کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دیہی پس منظر میں لکھے گئے ندیم کے افسانے ہمارے دیہاتی زندگی، وہاں کی طرز معاشرت، رہن سہن، طبقاتی نظام، معصومیت اور الھڑ پن کے دلکش جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ اردو میں پنجاب کے دیہات کے پس منظر میں اس سے خوبصوررت کہانیاں اور کسی نے نہیں لکھیں۔ شاید اس کی بنیادی وجہ ندیم کا شعور اور لاشعور ہے جس میں زندگی کے حوالے سے تمام بنیادی خدوخال دیہات ہی کے پس منظر سے متعلق ہیں۔ چونکہ ندیم کی پیدائش دیہات میں ہوئی اس کا بچپن اور لڑکپن گائوں (انگہ) میں گزرا۔ یہیں اس کے کچے پکے جذبات پروان چڑھے، اسی مٹی کی مہک اُسے اپنی رگوں میں اترتی محسوس ہوئی۔ دیہات ہی کی سادگی کا بے ساختہ پن ندیم کے لب ولہجہ کی پہچان بنا اور یہی فضا ہے جس کی گرفت سے وہ دیہاتی سے شہری بن جانے کے باوجود باہر نہیں نکل سکا۔

اسی طرح ان کے افسانوں کے موضوعات میں مقامی جنگوں کے علاوہ عالمی جنگیں بھی ہیں جن کی تباہ کاریوں کا نشانہ وہ ضرورت مند بنتے ہیں جن کے پیٹ روٹی مانگتے ہیں اور جن کے بدن لباس کو ترستے رہتے ہیں اور جو اپنی مادی ضروریات کے ہاتھوں مجبور ہو کر بخوشی غیر حکومت کے مقاصد کی تکمیل غیر محسوس طریقے سے کرتے ہیں۔ اور یوں غیروں کی جنگ میں ایندھن کا کام دیتے ہیں۔ ندیم کے ایسے افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ "ہیروشیما سے پہلے۔ ہیروشیما کے بعد" کا نام لیا جاسکتا ہے جو اردو کے بہترین اور بڑے افسانوں میں سے ایک ہے اور جس سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ جنگیں اپنے اختتام کے باجود بھی ایسے کئی سماجی مسائل پیدا کر جاتی ہیں جن میں نہ انسانوں کی عزت وعصمت محفوظ رہتی ہے نہ خاندانوں کی عظمت وآبرو۔

گوپی چند نارنگ نے درست کہا ہے کہ مقصد اور فن کا حسین توازن ندیم کی کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے۔ ندیم ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن اور عہدیدار بھی رہے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا بڑا ترقی پسند نہیں جتنا بڑا فنکار ہے۔ اگر چہ اس کی ذہنی وفکری تشکیل میں مارکسزم کا ایک نمایاں کردار ہے۔ تاہم وادب میں پروپیگنڈے کی بے اعتدالی کا کبھی شکار نہیں ہوا۔ اس کی جڑیں اپنی مٹی میں بڑی گہری ہیں۔ یوں وہ ایک غیر جانبدار مصنف کے روپ میں ابھرتے ہیں جن کے ہاں نظریے کی آمیزش سے تیار کیے گئے افسانے جابجا نظر آتے ہیں اور دوسری طرف رومان کی حسین فضا اور وطن کی مٹی سے محبت کا حوالہ بھی اُن کے افسانوں کا بنیادی خاصہ ہے۔

انتظار حسین

انتظار حسین (پیدائش: ۲۱ دسمبر، ۱۹۲۵ء - وفات: ۲ فروری، ۲۰۱۶ء) اردو کے ایک ناول نگار، افسانہ نگار اور تنقید نگار تھے، انہوں نے ایک داستان اور آپ بیتی طرز پر دو کتابیں لکھیں۔ حکومت فرانس نے ان کو ستمبر ۲۰۱۴ء میں آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹس اینڈ لیٹرز عطا کیا۔ انتظار حسین کا انتقال ۲ فروری ۲۰۱۶ء کو ۹۲ سال کی عمر میں لاہور کے ایک ہسپتال میں ہوا

انتظار حسین اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب اور بدلتے لہجوں کے باعث پیش منظر کے افسانہ نگاروں کے لیے بڑا چیلنج تھے۔ ان کی اہمیت یوں بھی ہے کہ انہوں نے داستانوی فضا، اس کی کردار نگاری اور اسلوب کا اپنے عصری تقاضوں کے تحت برتاؤ کرنا چاہا۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر حیرت کا ایک ریلا سا آتا ہے جس کی بنا پر ان کے سنجیدہ قارئین کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ ان کی خود ساختہ صورت حال حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس طرح کی صورت حال تخیل کے حوالے سے یورپ میں سامنے آئی۔

ان کی تحریروں کی فضا ماضی کے داستانوں کی بازگشت ہے۔ ان کے یہاں پچھتاوے، یاد ماضی، کلاسیک سے محبت، ماضی پرستی، ماضی پر نوحہ خوانی اور روایت میں پناہ کی تلاش بہت نمایاں ہے۔ پرانی اقدار کے بکھرنے اور نئی اقدار کے سطحی اور جذباتی ہونے کا دکھ اور اظہار کے ضمن میں بہت سی جگہوں پر انداز اور لب ولہجہ ترش ہو جاتا ہے۔

وہ علامتی اور استعاراتی اسلوب کو نت نئے ڈھنگ سے استعمال کرنے والے افسانہ نگار تھے، لیکن اپنی تمام تر ماضی پرستی اور مستقبل سے فرار اور انکار کے باوجود ان کی تحریروں میں ایک عجیب طرح کا سوز اور حسن ہے۔ اس میں ویسی ہی کشش ہے جو چاندنی راتوں میں پرانی عمارتوں میں محسوس ہوتی ہے۔ انتظار حسین کا فن عوامی نہیں۔ انہوں نے اساطیری رجحان کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ ان کے افسانوں کے اسرار معلوم کرنے کے لیے وسیع مطالعہ کرنا بھی لازمی ہے۔ ہجرت کے حوالے سے ایک خاص طرح کا تناؤ انتظار حسین کے ہاں جاری وساری ہے۔ اس صورت حال سے وہ خود کو منطقی طور پر الگ نہیں کر سکے۔ انہیں زندگی کی ظاہری بناوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ باطن میں جو حالت در پیش ہوتی اس کا خیال رکھتے۔ یہی باطن کی غوطہ زنی اور اسلوبیاتی تنوع انتظار حسین کی پہچان ہے۔ لیکن وہ اسے فکری اور نظری پسماندگی کا نام بھی دیتے ہیں۔ ایسے میں وہ فرد کی انفرادی سطح پر اخلاقی جدوجہد کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔ یہی موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح وہ مقام ہے جہاں پر انتظار حسین افسانے کے پیش منظر میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔

آخری آدمی ایک جائزہ

افسانے کا مزاج علامتی اور استعاراتی ہے۔ افسانے کا مرکزی خیال قصص القرآن سے ماخوذ ہے اور "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے بقول:

"آخری آدمی میں ہوس کاری اور نفس کی موت، انسانوں کو معاشرتی اور تہذیبی سطح سے بندروں کی حیوانی سطح میں اُتار دیتی ہے۔ لالچ اور مکر' داخلی طور پر روحانی زوال اور معاشرتی رشتوں کی شکست کی نشانی ہے"۔

مذکورہ افسانے کی کہانی بنیادی طور پر انسانی ہوس کی کہانی ہے، بعض افراد احکامِ الٰہی کی کھلی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں، جبکہ بعض افراد احکامِ الٰہی کی نافرمانی کرتے ہوئے مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیت کا کھوٹ، اعمال کو منفی بنا کر انسان کی بنیادی "کیمسٹری" تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اور صالح افراد کا چہرہ ان کے باطن کا آئینہ بن کر ان کی شخصیت کے گرد نور کا ایک ہالہ بنا دیتا ہے اور منافقت، ریاکاری اور بدکاری' آدم زاد کی شخصیت کا لازمی حصہ بن کر اس کے وجود، خاص طور پر اس کی آنکھوں میں ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار ایک شخص الیاسف ہے۔ یہ دانشمند اور صاحبِ شعور ہے، وہ یوم السبت کو شکار، تجارت اور دوسری سماجی سرگرمیوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی جانے والی پابندی کے پس منظر میں چھپی مصلحت اور حکمت کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے مختلف افراد کو حرص و ہوس اور لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے اور اس کے نتیجے میں آدمی سے بندر بنتا ہوا دیکھتا ہے تو اپنے آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ لالچ اور حرص سے مغلوب ہو کر آدمیت کے مرتبے سے نہیں گرے گا، لیکن آخرکار اس کی عقل ہی اسے فریب دیتی ہے' چنانچہ وہ صریح خلاف ورزی کی بجائے مکر، حیلے اور خود فریبی کا سہارا لیتا ہے، وہ ہفتے کے روز، سمندر کے قریب ایک گڑھا کھود کر اس گڑھے کو سمندر سے ملا دیتا ہے، سمندر کی لہریں بہت سی مچھلیوں کو اس گڑھے میں مقید کر دیتیں اور وہ اگلے روز بہت آسانی سے ان مچھلیوں کا شکار کرتا اور حاصل ہونے والی آمدنی کو اپنی عقلمندی کا کرشمہ قرار دیتا ہے۔

الیاسف خود فریبی کی چادر اوڑھ کر اپنے حال میں مست نظر آتا ہے، لیکن ایک دن اچانک اسے اپنی جسمانی ساخت میں تغیر کی آہٹ محسوس ہوتی ہے اور وہ چاہنے کے باوجود اس تبدیلی سے خود کو محفوظ نہیں رکھ پاتا اور یوں وہ اپنے قبیلے میں بندر بن جانے والا آخری آدمی قرار پاتا ہے۔

الیاسف کے آدمی سے بندر بننے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا ذاتی ہے، جس کے باعث اس کے باطن میں پنپنے والے منفی جذبات اس کی شخصیت کو توازن سے محروم کر دیتے ہیں، جبکہ دوسری وجہ سماجی ہے۔ جس کے باعث مادیت پرستی کا زہر سماجی اقدار کے وجود میں سرایت کر جاتا ہے اور فرد سماجی تفاعل سے محروم ہو کر رشتوں کی شکست و ریخت کا مشاہدہ کرتا ہے' جہاں ابلاغ کا عمل اس قدر بے وقعت ہو جاتا ہے کہ لفظوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ انسان کا بندر بن جانا ایک بڑا سانحہ تھا، جس کے نتیجے میں اسموں سے محروم ہو کر انسان، شعور و آگہی کے ان تمام ثمرات سے محروم ہو گیا جنہوں نے اسے مسجودِ ملائک بنا دیا تھا۔

گوپی چند نارنگ مذکورہ افسانے کو جدید دور کے انسان کی مادیت پرستی اور بے اطمینانی کا نوحہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اخلاقی اقدار کی شکست اور اجتماعی اطمینان کے فقدان کے نتیجے میں ایسا نفسی انتشار ہے کہ انسان بحیثیتِ انسان اپنی جون کو بھی برقرار نہیں رکھ پا رہا۔"

مذکورہ افسانے کی انفرادیت کا ایک اہم سبب اس کا اسلوب ہے، مصنف نے شعوری طور پر کرداروں کے ناموں، فضابندی اور صورتِ واقعہ کی تشکیل میں قدیم عرب کی فصاحت و بلاغت کو پیش نظر رکھا ہے۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، اس حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انتظار حسین نے اس زبان اور مخصوص حکایت کے سارے علامتی امکانات کو کنگھالنے کی کوشش کی ہے اسی لیے ان کا استعاراتی بیان پیچیدہ تجربات اور زندگی کے نہاں خانوں میں چھپے ہوئے حقائق کو اپنے نور سے منور کرتا ہے"۔

ڈاکٹر انور احمد، انتظار حسین کے اسلوب کے تخلیقی عناصر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انتظار حسین کے فن کا بنیادی جوہر یہ ہے کہ وہ تاریخ و تہذیب کے پراسرار اور پیچیدہ جنگل میں اُتر کر اظہار و ابلاغ کے علامتی وسیلے کو معتبر بناتا ہے۔"

مجموعی طور پر "آخری آدمی" نہ صرف انتظار حسین کا بلکہ اُردو کا بھی ایک شاہکار افسانہ ہے، جس میں مصنف نے اپنی فکری و فنی بصیرت کا اظہار کرتے ہوئے اِسے آدمی کی جگوں اور صدیوں کو محیط کہانی کا استعارہ بنا دیا ہے۔

نثری متن

سیر پہلے درویش کی

پہلا درویش دوزانو ہو بیٹھا اوراپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا:

یا معبود اللہ! ذرا ادھر متوجہ ہو، اور ماجرا اس بے سروپا کا سنو!

یہ سرگزشت میری ذرا کان دھر سنو!

مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر سنو!

جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مرے تئیں

اُس کا بیان کرتا ہوں، تم سر بہ سر سنو!

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا، مَلِک التجار خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے۔ اور لاکھوں روپے نقد، اور جنس ملک ملک کی، گھر میں موجود تھی۔ اُن یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے: ایک وہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی، اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی۔ اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب فن، سوداگری کا بہی کھاتہ، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزری۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ یک بارگی یتیم ہو گیا کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا "دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں، اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے اپنے کاروبار لین دین سے ہشیار رہو" تسلی دے کر رخصت ہوئے گماشتے کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے "کوٹھی نقد و جنس کی، اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجیے" یک بارگی جو اس دولتِ بے انتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کا حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت، پردے، چلونیں، تکل کی لگادیں اور اچھے اچھے خدمت گار دیدہ رو نوکر رکھے۔ سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوادیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی، غنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹے خوشامدی، آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں، واہی تباہی ادھر اُدھر کی کرتے اور کہتے: "اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گل گلاب کھنچوائیے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر، اُن کے ساتھ پیجیے اور عیش کیجیے۔"

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا، اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا۔ گویا لوٹ مچادی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کیدھر جاتا ہے۔ مال مفت دل بے رحم۔ اس درخرچی کے آگے، اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں یک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا، ہر بات میں زبان سے

نثار کرتے تھے، کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ بانٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے، اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی، سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے "یہ کیا تمہارا حال ہوا۔" سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑا کے کھینچے، تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ لاچار، بے حیائی کا برقعہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلیے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد، نہ بہن سے کچھ سلوک کیا، نہ خالی خط لکھا۔ بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے اُن کا بھی جواب اس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانہ نظر میں ٹھہرا۔ جوں توں، پاپیادہ، خالی ہاتھ، گرتا پڑتا ہزار محنت سے وے کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جا کر اُس کے مکان پر پہنچا۔ ماجائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے، مجھ پر صدقے کیے۔ کہنے لگی "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا، لیکن بھیا، تیری یہ کیا صورت بنی؟" اس جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی، خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس، بہت اچھا تکلف کا، میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور حلوا سوہن، پستہ، مغزی، ناشتے کو، اور تیسرے پہر میوے، خشک و تر، پھل پھلاری، اور رات دن دونوں وقت، پلاؤ، نان قلیے، کباب، تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر، اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا۔ خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجالایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن، وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، کہنے لگی "اے بیرن! تو، میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا۔ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا، اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی، چھوٹے بڑے، بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا ہے۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔" یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی، اُس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا "اچھا، اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔" یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے، پچاس توڑے اشرفی کے، اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر، میرے آگے لا رکھے اور بولی "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے، تم ان رُپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے، دست آویز پکی لکھوا لو، اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیرت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجو یا آپ بیچیو۔" میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشِ خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا۔ بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور گھوڑا، جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان، ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی "سدھارو! تمہیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔" میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا۔ "تمہارا بھی اللہ حافظ ہے، میں نے قبول کیا۔" وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے، دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا، دمشق کے پاس جا پہنچا۔

توبۃ النصوح

قصہ کوتاہ، کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکھے، بے فکرے کبھی کی لمبی تاک کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عمل داری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ[wi1] کی اردلی[wi2] کا جمعدار[wi3] تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بدعنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد[wi4] دلی کی روداروں[wi5] میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودے کہ دور کی قرابت تھی، حسبتہ للہ، اس کا تکفل[wi6] اپنے ذمے لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے، پوتے، نواسے کثرت سے تھے، انہوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت، محل سرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا، اور سات روپے مہینے کے کرائے کی دو کانیں مرزا کے نام کرا دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین تین آدمی اور سات روپے کل کی کائنات، اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے، جن کو صدہا روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ کسی کو ماموں جان، کسی کو بھائی جان، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی[wi7] رشتوں ناتوں سے جلتے اور دِق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں، مگر امیرزادگی نہ تھی تو کیسے نبھے۔ دو کانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی، سر پر دہری بیل کی بھاری کام دار[wi8] ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے[wi9]: اوپر شبنم[wi10] یا ہلکی سی تن زیب[wi11] نیچے کوئی طرح دار ساڈھاکے کا نینو[wi12]۔ جاڑا ہوا تو بانات[wi13] مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں۔ خیر، یہ تو صبح شام، اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی[wi14] جس میں حریر[wi15] کی سنجاف[wi16] کے علاوہ گنگا جمنی[wi17] کم خواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی۔ سرخ نیفہ[wi18]۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں[wi19] کا ہوا تو کلی دار[wi20] اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اٹلے سے دو دو قدم آگے، اور اگر تنگ مہری[wi21] کا ہوا تو نصف ساق[wi22] تک چوڑیاں، اور اوپر جلد بدن کی طرح مَڑھا ہوا۔ ریشمی ازاربند، گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی[wi23] سے چھیلا بنے ہوئے، سربازار، چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم کا مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے[wi24] لگی تھی کہ گویا ایک جان و دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا، شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کے محل سرا کی ڈیوڑھی[wi25] پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں، اور ان میں سے ایک نے پوچھا: "کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

کلیم: جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی: کون مرزا؟

کلیم: مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی: یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ کلیم نے کہا: "کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟"

لونڈی: ہے کیوں نہیں۔

کلیم: پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی: جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے، موأ ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی: اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تیئں جمعدار کا بیٹا بنایا کرتا ہے۔ (کلیم سے مخاطب ہو کر) "کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگ زرد زرد ہے، آنکھیں کرنجی، چھوٹا قد، دبلا ڈیل، اپنے تیئں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم: ہاں ہاں، وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی: تو میاں، اس مکان کے پچھواڑے، اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے، وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جاکر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ، جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے: آہا! آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا، میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔

کلیم: چلیئے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا: پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرادوں۔

کلیم: میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا: بسم اللہ، تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے، بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی مسجد ضرار کی طرح ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے، نہ کوئی طالب علم، نہ کوئی مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود **کھرنجے**[wi26] کا فرش بن گیا ہے۔

مرزا کے انتظام میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب، بطور **دفع دخل**[wi27] مقدر، فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے، **خفقان**[wi28] کا عارضہ، **اختلاج قلب**[wi29] کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا، اسی وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے تو یہ بتائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا: پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم: سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ نہیں ہے، اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا: خیر، نیت شب حرام، صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے۔ میں جاکر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علالت میں **اشتداد**[wi30] ہے

کلیم: یہ کیا ماجرا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور **کٹڑے**[wi31] اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں، میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم کی کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو، یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب

کے لیے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے، ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکے پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اس جاہ و حشمت کا ایک شمہ[wi32] بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا: آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال[wi33] ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی، مگر افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنٰی کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارا کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منانے جائیں۔

کلیم: لیکن آپ نے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا۔

مرزا: اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے، اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمار داری کروں۔

کلیم: خیر، مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے، تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا: چراغ کیا میں نے تو لمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہو جائیں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا، کیوں کہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی، دوسرے یہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے، تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے معترض نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عن قریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے، تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود ہی کہہ دیا کہ سنو یار، میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا: سچ کہو! نہیں جھوٹ، بہکاتے ہو۔

کلیم: تمہارے سر کی قسم، میں بھوکا ہوں۔

مرزا: تو مرد خدا، آتے ہی کیوں نہ کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی، جس کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دل بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہو گی، رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کا کہہ کر گئے تھے، یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگا لیے، اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا: یار، ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا، واللہ ہاتھ تو لگاؤ، دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوش بو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو، کمال

بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیئے، اتنی تورات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سے سنا ہے کہ حضوروالا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلاناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقعی میں آپ ذرا غور سے دیکھئے، کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا، ایسے خوب صورت، خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھیے۔ کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی غرض دونوں رنگ خوش نما۔ یوں تو صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے؟

کلیم: فرمایئے۔

مرزا: چنا ایک بار حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جوں میں نے سرزمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں، مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع وبرید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب ذرا بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے۔ پکا تو شاخ وبرگ، بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ، اس کو چکی میں دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں، بھاڑ میں بھونیں، بیسن بنائیں، کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں، گھنگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بے باکانہ چپڑ چپڑ بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظام حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت، یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا، ورنہ میر مدن کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں؟

آنگن

پاکستان بن گیا۔۔۔۔لیگی رہنما کراچی دار لحکومت جا چکے تھے۔مشرقی پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔بڑے چچا اس صدمے میں جیسے نڈھال سے ہو گئے تھے۔بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے:یہ کیا ہو رہا ہے؟؟؟؟

یہ کیا ہو گیا؟؟؟؟؟

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے،تو وہ اُن کا سر سہلانے لگتی۔بڑے چچا آپ آرام کیجئے،آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا،اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی اِن کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

کریمن بوا فساد کی خبریں سُن سُن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں اپنے شہر میں فساد تو نہ ہوا تھا مگر سب کی جان پر بنی رہتی تھی کہ پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔

کہاں ہو گا میرا شکیل؟؟؟؟؟؟بمبئی میں فساد کی خبر سُن کر بڑی چچی بلکنے لگیں۔

تمہارا پاکستان بن گیا جمیل،تمہارے ابا کا ملک آزاد ہو گیا،پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا؟؟؟؟؟؟؟؟؟

سب ٹھیک ہو جائے گا اماں،وہ خیریت سے ہو گا۔یہ فساد وساد تو چار دن میں ختم ہو جائیں گے،جمیل بھیا اِن کو سمجھاتے مگر اِن کا چہرہ فق رہتا۔

شام کو سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آ گیا۔اُنہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ اُنہوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لئے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجئے اور تیار رہیئے۔

بس ابھی تار دے دو جمیل میاں،ہماری تیاری میں کیا لگے گا،ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں،ہے!اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ سکتا ہے؟؟؟مارے خوشی کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

جمیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فساد اِن کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں،مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

آپ یہاں محفوظ ہیں۔۔۔۔۔میں آپ کے لئے اپنی جان دے دوں گا،اُنہوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا،کیسی سفارشی نظریں تھیں ،مگر عالیہ نے اپنی نظریں جُھکا لیں۔

میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں،پاکستان میں اپنوں کی حکومت تو ہو گی،پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ زندہ نہیں رہ سکتی۔۔۔۔واہ،مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔

عالیہ جانے پر راضی نہیں ہو گی چھوٹی چچی،وہ نہیں جائے گی،وہ جا ہی نہیں سکتی،جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا۔

تم اچھے حقدار آ گئے،کون نہیں جائے گا۔۔۔۔۔اماں ایک دم بپھر اُٹھیں۔

تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

ضرور جایئے چھوٹی چچی،جمیل بھیا نے سر جھکا دیا،اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی،صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہِل بھی نہ سکے گی۔

میں ابھی تار کیئے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں،جمیل بھیا اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جا سکتی، اُسے کوئی نہیں لے جا سکتا مگر اُس کے گلے میں تو سینکڑوں کانٹے چبھ رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اُس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں، مگر وہ کیوں رکے کس کے لئے ؟؟؟ اُس نے سوچا اور پھر جیسے بڑی سکون سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں تو ہمیشہ کے لئے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔

کریمن بوا!!!!!!!! اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کریمن بوا آج تو ڈائنوں کی طرح چیخنے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ارے کوئی تو اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو، سب چلے گئے، سب چلے جائیں گے، مگر یہ کہیں نہیں جاتا۔

بیٹھک میں اسرار میاں کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

کیا تم سچ مُچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلہن ؟؟؟؟؟ بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی چچی نے پوچھا۔

ظاہر ہے چلی جاؤں گی، اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔

یہ گھر تمہارا ہے چھوٹی دلہن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو، بڑی چچی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کر لیں، شائد وہ تنہائی کے بھوت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لئے اوپر بھاگ گئی، دھوپ پیلی پڑ کر سامنے کے مکان کے اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی، ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

کُھلی فضا میں آکر اُس نے اطمینان کی سانس لی، اور مسافروں کی طرح ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی کہ اب کیا ہو گا، شائد اچھا ہی ہو، وہ یہاں سے جا کر ضرور خوش رہے گی۔

جب وہ نیچے اُتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے، صرف کریمن بوا جانے کس بات پر بُڑبُڑا رہی تھیں اور پُھرتی سے روٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔

جمیل بھیا کہاں گئے، وہ اب تک کیوں نہیں آئے، عالیہ نے سونی کرسی کی طرف دیکھا، جانے یہ سر پھرا آدمی اِسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لالٹین کی بتّی خراب تھی اس لئے اُس میں دو لویں اُٹھ رہی تھیں اور ایک طرف سے چمنی سیاہ ہو گئی تھی، مدھم روشنی میں اماں بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے، میں تار کر آیا ہوں چھوٹی چچی، اُنہوں نے دھیرے سے کہا۔

تم اتنی دیر باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آ جایا کرو، جانے کب یہاں بھی گڑبڑ ہو جائے، بڑی چچی نے کہا۔

رہنا تو پڑتا ہے، مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، اُنہیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پُر امن رکھیں گھر بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا۔

توبہ اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا، تم نے تار پر پتہ ٹھیک لکھا تھا نا ؟؟ اماں نے پوچھا۔

آپ اطمینان رکھیں، پتہ ٹھیک تھا۔

خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں، کیا بری حالت ہو چکی ہے۔ اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو، اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

کون جا رہا ہے پاکستان ؟؟؟؟؟ بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا، اُنہوں نے اماں کی باتیں سُن لیں تھیں۔

میں اور عالیہ جائیں گے، اور کس نے جانا ہے۔ اماں نے تڑاق سے جواب دیا۔

کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لئے جاؤ گے پاکستان ؟

یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قُربانیاں دی ہیں، اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟

اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے، بڑے چچا سخت جوش میں تھے۔

ماشا اللہ آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کِھلانے کے نہ پِلانے کے، کون سا دُکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا۔ میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا، آپ ہی نے اُنہیں مار ڈالا، میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں، مارے غصّے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

کریمن بوا! میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو۔ بڑے چچا سر جُھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟؟؟؟

بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچّھی طرح سُن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابّا سے تھی، عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی۔

امّاں کیا کہتی رہ گئیں اُس نے ذرا بھی نہ سُنا۔

کیا تم سچ مُچ جا رہی ہو بیٹی؟؟؟؟؟؟

ہاں بڑے چچا، امّاں جو تیار ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔

بڑے چچا میں تو امّاں کا واحد سہارا ہوں، میں اُنہیں کس طرح چھوڑ دوں، وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تڑپوں گی،

آپ،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

چھوٹی دلہن کو مجھ سے سخت نفرت ہے ٹھیک ہے، میں نے تم لوگوں کے لئے کچھ بھی نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آتی، مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جا رہی ہے، پھر دکانوں کو چلانے کے لئے دس پندرہ ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے۔ میں چھوٹی دلہن کی سب شکائیتں رفع کر دوں گا۔

اُنہوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا۔۔۔۔۔

کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟؟؟

لالٹین کی روشنی مدّھم ہوتی جا رہی ہے، اب انشااللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال کرا لوں گا، اور اب تم ایم۔ اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو، میرا خیال ہے تم اگلے سال ضرور داخلہ جمع کروا دو۔

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا، آنسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جی ہی جی میں گُھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ نہ بول سکی۔

خدا آپ کو سُکھ دے بڑے چچا، خدا آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے، وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔

وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے۔

اسرار میاں بیٹھک میں داخل ہونے کے لئے پٹ کھول رہے تھے، عالیہ اُٹھ کر صحن میں آ گئی۔

امّاں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں، جمیل بھیّا اب تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے تک آنگن میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی۔

شبنم سے بھیگ کر رات بڑی روشن ہو رہی تھی، چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔

"تیری گٹھری میں لاگا چور۔۔۔مسافر جاگ ذرا۔۔۔۔۔

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی، کیسی عجیب حالت ہو رہی تھی، جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔

کیا یہ میں ہوں۔؟؟؟؟؟؟؟؟

اُس نے اپنے آپ سے پوچھا، اور پھر اپنی آواز سُن کر حیران رہ گئی۔۔۔۔۔۔حد ہے دیوانگی کی، وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک بار مُڑی تو جمیل بھیّا بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے، وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگی، اب یہ کیا کہنے آئے ہیں، اِنہوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا۔

کیا سچ مُچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے ؟؟؟؟ اُنہوں نے پوچھا۔

ہاں! اس نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔

تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی، تم نے ایک بار کہا تھا کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں، میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔

میں ہر جگہ خوش رہوں گی، مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے۔

میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟؟؟؟؟؟؟؟

کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔

تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا تم کو یہ قرض چُکانا ہو گا۔ وہ جانے کے لئے مڑے، "تم وہاں خوش رہو گی ناں"؟؟؟؟

اُنہوں نے رک کر پوچھا۔۔۔۔۔

وہ چپ رہی، جمیل بھیّا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے اور اس نے محسوس کیا کہ اِس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔

بڑی دیر تک یونہی ٹہلنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو چھمّی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اُسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی، یہ رات پہاڑوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، کوئی اِسے گزار دے، کوئی صبح ہونے کا پیغام سُنا دے۔

اُسے صبح ہونے کا انتظار ہے، صبح وہ چلی جائے گی اور اس کرب سے نجات حاصل کر لے گی۔

سب بول رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، پھر بھی کیسا سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ چاند کی کونسی تاریخ ہے اب تک چاند نہیں نکلا۔

چھالیہ کاٹتے کاٹتے عالیہ نے سب کی طرف دیکھا، جمیل بھیّا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنی کرسی پر بیٹھے ایک شعر گنگنائے جا رہے تھے۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہو گی میرے غم کی ترجمانی

جمیل بھیّا آج سارا دن باہر نہیں نکلے تھے، آج اُن کو فرصت ہی فرصت تھی جیسے سارے کام ختم ہو گئے اور اب اِنہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

بڑی بھابھی میں تو جا رہی ہوں مگر آپ میری ایک بات یاد رکھیئے گا کہ اگر آپ نے بڑے بھیّا اور جمیل میاں کو قابو میں نہ کیا تو آپ کی ساری عمر یوں ہی گزر جائے گی، اب تو آزادی بھی مل گئی اب کون سا بہانہ رہ گیا ہے جو یوں سارا دن دونوں باپ بیٹے آوارہ پھرتے ہیں۔ اماں بڑی چچی کو سمجھا رہی تھیں۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری۔۔۔۔۔۔۔ کہ ہے داستاں ادھوری۔۔۔۔۔۔۔

جمیل بھیّا اِسی ایک شعر کو رٹے جا رہے تھے۔

اِس شعر کو بار بار پڑھ کر وہ کیا جتانا چاہتے ہیں، وہ اِس سے کیا کہہ رہے ہیں؟؟؟؟؟

عالیہ کا سروتا بڑی تیزی سے چھالیہ کاٹنے لگا، اللہ میاں اگر اس وقت مجھے بہرا کر دے تو کتنا اچھا ہو۔

چھوٹی دلہن ایسا جانا پڑتا ہے کہ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے، بھرا پورا گھر تھا دیکھتے دیکھتے سب تڑی بڑی ہو گئے، زمانے زمانے کی بات ہے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

قربان جاؤں اُس مالک کے جس نے ایک ملک کے دو ملک بنا دیئے، اپنے مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی پر ہم اکیلے رہ گئے۔ کریمن بوا جدائی کے صدمے سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

تم بھی چلو کریمن بوا۔۔۔ اماں نے بڑے خلوص سے کہا۔

اب تو یہی دعا کریں چھوٹی دلہن کہ اس گھر سے لاش نکلے میری، آج یہاں سے چلی جاؤں تو مرنے کے بعد مالکن مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی، وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں وہاں سے کیونکر پاؤں نکالوں۔

سیتا نے رام کی کھینچی ہوئی لکیر سے باہر قدم رکھا تھا تو راون اُٹھالے گیا تھا،سیتا نے جیتے جاگتے رام کی حکم عدولی کی تھی، مگر تم کریمن بوا رہو گی تم کو کون جانے گا، تمہارا قصّہ کون لکھے گا۔؟؟؟؟؟

عالیہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کریمن بوا کو دیکھا، لالٹین کی مدّھم زرد روشنی میں جدائیوں کے دُکھ کتنے اُجاگر ہو رہے تھے۔

چھوٹی دلہن اب بھی اپنا فیصلہ بدل دو، مت جاؤ چھوٹی دلہن۔ بڑی چچی کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری۔۔۔ جمیل بھیّا ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر جیسے اس ایک شعر کی کیفیت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

اللہ کوئی تو اِس رات کو گزار دے، ورنہ آج وہ اپنی جان سے گزر جائے گی، عالیہ نے سر وتار کھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

چاند نکل رہا تھا، آسمان روشن ہو تا جا رہا تھا۔

چھمّی کا خط آیا تھا، اُس نے کیا لکھا ہے عالیہ ؟؟؟ بڑی چچی نے پوچھا۔

اُس نے لکھا ہے پاکستان جانا مبارک ہو ضرور جائیے۔ اُس پاک سرزمین کو میری طرف سے چومیے گا اور مجھے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجئے گا، میں اُسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی میں بدنصیب تو وہاں بھی نہیں جاسکتی اور سب کو سلام دعا لکھی ہے، عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سُنا دیا۔

اور بھی کچھ لکھا ہے کیا؟؟؟؟؟؟ بڑی چچی نے پوچھا۔

بس یہی سلام دعا خط اوپر رکھا ہے۔

میری موت سے نہ ہو گی میرے غم کی ترجمانی۔۔۔۔۔ جمیل بھیّا اب بھی سب سے بے نیاز تھے۔

جانے ہمارے مسلمانوں کا ملک کیسا ہو گا، مکان بھی مل جائے گا جلدی سے کہ نہیں، ہوٹل میں نہ ٹھہرنا چھوٹی دلہن، صحت خراب ہو جائے گی وہاں کے کھانے سے۔۔۔

کریمن بوا کو اب آگے کی فکر ستا رہی تھی۔

تم پریشان نہ ہوا کرو کریمن بوا جاتے ہی خط لکھ دوں گی، اماں نے کہا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے رات سرد ہوتی جا رہی تھی مگر سب لوگ بیٹھے تھے عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ بس اب کسی طرح اوپر بھاگ جائے۔

اچھا بھئی اب سونے کو چل دیئے۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ جمیل بھیّا کرسی سے اُٹھ پڑے۔۔۔۔۔۔

مجھے اور زندگی دے۔۔۔۔۔۔۔ وہ کمرے میں چلے گئے۔

بیٹھک کے دروازے کُھلے اور بند ہو گئے، بڑے چچا ایک ذرا دیر کو بھی اندر نہ آئے عالیہ انتظار کرتی رہ گئی۔

گلی میں آوارہ کتے بھونک کر رو رہے تھے، کاش نیند آ جائے، اُس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔

ایک دن جب وہ یہاں آئی تھی اور پہلی رات اس کمرے میں گزاری تھی تو ساری رات سو نہ سکی تھی اور آج جب وہ یہاں سے جا رہی ہے تو پھر نیند نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی بہت سی باتیں اُس کا کلیجہ نوچ رہی تھیں۔۔۔۔ جمیل بھیّا نے مجھ سے ایک بات بھی نہ کی، کیا جاتے جاتے وہ اب مجھ سے کچھ نہ کہیں گے، کیا اب کچھ کہنے کو باقی رہ گیا؟

اللہ بڑے چچا کیا سوچ رہے ہونگے، وہ بڑے چچا کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اور چھمّی خدا کرے اُسے پاکستان آنا نصیب ہو جائے۔ جاگتے جاگتے صبح ہو گئی، نچلی منزل سے برتنوں کے کھڑکنے اور باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

اُس نے کمرے پر ایک وداعی نظر ڈالی اور نیچے آ گئی۔

ناشتا تیار تھا وہ اماں اور بڑی چچی کے ساتھ بیٹھ گئی، کمرے کے کُھلے دروازے سے اس نے دیکھا کہ جمیل بھیّا اب تک چادر تانے سو رہے تھے۔

حد ہو گئی بے مروتی کی، میں جا رہی ہوں اور ان کی آنکھ بھی نہیں کُھلتی، جیسے موت کی نیند آ گئی ہے۔

عالیہ کو کیسی ٹھیس لگ رہی تھی اُن کے یوں ٹھاٹھ سے سونے پر۔ وہ چلی جاتی تو پھر سو لیتے۔ ناشتے کے بعد امّاں نے اپنے سارے سامان کا جائزہ لینا شروع کر دیا کپڑوں اور ہلکے پُھلکے دو کمبلوں کے سوا تمام سامان چھمّی کے کمرے میں بھر دیا گیا تھا کہ جب اچھا وقت آئے گا تو پھر آ کر سب کچھ لے جائیں گے۔

"تانگے آ گئے ہیں۔" اسرار چچا نے باہر سے آواز لگائی تو وہ جلدی سے بیٹھک کی طرف بھاگی۔

"کیا آج بڑے چچا بھی سوتے رہیں گے ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟"

تمہارے بڑے چچا تو تڑکے ہی کہیں چلے گئے، کہتے تھے کہ کام ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ میں سب کو جاتے نہ دیکھ سکوں گا۔

کریمن بوا نے بڑی رقت سے بتایا۔

یہ کہو ناں کریمن بوا کہ وقت نہیں تھا جو رخصت کرنے بیٹھے رہتے۔۔۔۔۔۔۔ اماں نے برا سا منہ بنایا۔

بڑی بھابھی میرا سامان حفاظت سے رکھیئے گا، اِس کمرے میں تالا لگا دیجئے گا، امّاں نے ایک بار پھر ہدایت کی۔

اللہ آج کی سیٹیں ریزرو نہ ہوتیں، آج وہ رک سکتی، بڑے چچا سے ملے بغیر وہ کس طرح جا سکتی ہے۔ وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئی۔

اُٹھ جاؤ جمیل! تمہاری چچی اور بہن جا رہی ہیں، انہیں رخصت تو کرو۔

بڑی چچی نے تیسری بار جمیل بھیّا کو آواز دی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جلدی کرو کریمن بوا، ہوائی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرتا، وقت پر اُڑ جائے گا، اسرار میاں نے پھر صدا لگائی۔

خدا نہ کرے، میرا بھائی آج لاہور کے ہوائی اڈے پر انتظار کرے گا، جو ہم لوگوں کو نہ پایا تو کلیجہ پھٹ سا جائے گا اُس کا۔۔۔۔۔۔۔۔ امّاں نے بوکھلا کر برقع اوڑھ لیا۔

اب تم بھی جلدی کرو ناں۔۔۔۔۔ اُنہوں نے جھَلّا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو اب تک بے سُدھ سی بیٹھی تھی۔

بہت وقت ہو رہا ہے، پہلے سے پہنچنا اچھا ہوتا ہے۔ اسرار میاں کی آواز رکتی ہی نہ تھی۔

ارے کوئی اِس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو، کریمن بوا کلیجہ پھاڑ کر رو دیں۔

کریمن بوا اور بڑی چچی امّاں سے مل مل کر رو رہی تھیں، مگر وہ دم بخود کھڑی رہی، اِسے تو رونا بھی نہ آ رہا تھا۔

اگر شکیل وہاں ملے تو خط ضرور لکھنا، بڑی چچی نے عالیہ کو لپٹا کر سرگوشی کی۔

جاؤ خدا کو سونپا۔۔۔۔۔ اُن کی آواز کانپ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ ارے جمیل اب تو اُٹھ جا۔۔۔۔۔۔ بڑی چچی نے زور سے پکارا۔

میں جا رہی ہوں خود مل لوں گی، عالیہ نے کہا۔

کیوں مل لوگی ؟؟؟؟؟؟؟؟؟ وہ تو مارے نفرت کے ملنا نہیں چاہتا، اماں نے تیوریوں پر بل ڈال لئے۔ "بس اب چلو جلدی"

میں جا رہی ہوں، خدا حافظ۔

عالیہ نے جمیل بھیّا کے منہ پر سے چادر کھینچ لی اور پھر جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

بھیگی اور سوجی ہوئی آنکھوں میں ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں، پھر بھی وہ آنکھیں تو اِس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

تم جاتیں کیوں نہیں بے وقوف لڑکی ؟؟؟؟؟؟؟؟

کیا یہی دیکھنے کے لئے مجھے جگانے آئی تھیں ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اُنہوں نے پھر منہ چُھپا لیا۔

جلدی چلو عالیہ۔۔۔۔۔۔اماں کی آواز آئی۔

تب عالیہ کو خیال آیا کہ اِسے جانا ہے باہر تانگا کھڑا ہے مگر اِس کے پاؤں کیوں نہیں اُٹھتے، اب وہ جاتی کیوں نہیں اور یہ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں چھا رہا ہے۔

کریمن بوا جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے اور چھوٹی دلہن سے اور عالیہ بی بی سے میری دعا کہہ دو اور کہہ دو کہ میرا کہا سُنا معاف کریں اور کہہ دو کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسرار میاں کی آواز رک گئی۔

خدا کرے تمہاری زبان تھک جائے اسرار میاں۔۔۔۔۔کریمن بوا نے تڑپ کر دعا مانگی۔

عالیہ سب کچھ سُن رہی تھی مگر اِس کے پاؤں ارے کوئی اِسے کھینچ کر ہی لے جائے، وہ اس کمرے سے تو نکل جائے۔

تم اِس لئے دیر کرا رہی ہو کہ ہوائی جہاز ہم کو چھوڑ کر اُڑ جائے، میرے بھائی کے ٹکٹوں کے دام غارت جائیں، اور وہ ہمیں اس جہاز میں نہ پا کر پاگل ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اماں جانے اور کیا کہتیں کہ عالیہ وحشیوں کی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

" آپ کے بھائی اور بھاوج سے اتنا بھی نہ ہوا کہ چار پانچ دن ہماری وجہ سے ٹھہر جاتے، ہمارے ساتھ سفر کر لیتے اور اب ہمارے لئے پاگل ہو جائیں گے، افوہ "

عالیہ زور سے بولی اور پھر بڑی چچی سے لپٹ کر سسکنے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

امراؤ جانِ ادا

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنیئے مرزا رسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سر گزشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد، نامراد، آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگ خاندان، عار دو جہان کے حالات سن کے مجھے ہر گز اُمید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنیئے اور اچھی طرح سنیئے:

باپ دادا کا نام لے کر اپنی سرخ روئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی، نائی، دھوبی، کمہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلے میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خان تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا، کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی، بھائی ابا ابا کر کے دوڑا، دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اُٹھالیا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کنارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جارہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کنارا چھیننے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں اُدھر میرے تقاضے شروع ہو گئے "ابا، اللہ! گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو! میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے، تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا پہنوں گی"۔ جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اُٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا، خدا کا شکر ادا کیا۔ ابا نے عشاء کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اُٹھے، نماز پڑھی، اسی وقت میں کھٹک سے اُٹھ بیٹھی، پھر فرمائشیں شروع ہوئیں:

"میرے ابا! آج نہ بھولنا، گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا! شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا"۔ ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے، ایک دو ہوا میں اُڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں، کیوں کہ ابا پہر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پرونے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی، یا دروازے پر املی کا درخت تھا، وہاں چلی گئی۔ ہجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے، بھیا کو بٹھا دیا، خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے! کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی۔ کیوں کہ ہجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا، نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی، وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کٹھریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کھڑکیاں تھیں۔ دالان کے سامنے باورچی خانہ تھا، دوسری طرف کوٹھے کا زینہ، کوٹھے پر ایک کھپریل، دو کوٹھریاں۔ کھانے پکانے کے

برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا، محلے کی عورتیں خود ہی کنویں سے پانی بھرلاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے، تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں، ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا، مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر سے کچھ ایسا بُرا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی، مگر چمچخی اور پہیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا، اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائے جامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا، ٹول کا نیفہ، نینو کی کرتی، تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھی۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا، مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے ہوئے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی، اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کناروں کی پھاندیاں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا، بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے، کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں تو میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی، اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ! میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہم سن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے، میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنتا ہے۔ میرا دولہا عید کے دن کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا، گلبدن کا پائجامہ، مصالے کی ٹوپی، مخملی جوتا۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک پھسینٹا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی، کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی، مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو، مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چنداڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا تھا۔ موا چاندی کا تار تھا، شاید ایک آنے سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ یہ اب کہتی ہوں، اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی، قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیے میں اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی، ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آ گئے۔ انہوں نے مجھے چمکارا، اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت میرے دل کو کسی قدر تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی، اماں ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی، مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے اسے گود میں نہیں لیا، مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگالیا، گود میں اُٹھالیا، پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اُتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے رُلادیا، لگیں گھر کیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا، مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں، کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے گلے کا سب گہنا اُتار کے ابا کے حوالے کیا کہ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوادو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو اُجلوادو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے، باقی نکال کے علیحدہ کر دیے کہ ان پر قلعی کرادو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا "اوہ جی ہو گا تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہے، وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں، سسرال کا نام بُرا ہوتا ہے، میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے"۔

مرزارُسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی

ابتدا آوارگی کی جوش وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے، کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں، بہن جس کو دیکھتی ہیں، اسی حالت میں ہے، مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں، اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی، اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کم بخت، ادماتی تھی، شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی، آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا، نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی، نکل کھڑی ہوئیں۔ یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا، رانڈ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جہاں سوائے گم راہی کے کوئی راستہ نہ تھا۔

دلاور خاں، جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا، مواڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد میں یہ گرفتار ہوا تو محلے سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ ابا بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ گرائی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا "دل جمعدار! تم سچ سچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا ایک کبوتر اُڑالیا۔ لینے گئے، نہ دیا۔ چار آنے دیتے تھے، وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو

نوکری پر چلے گئے، جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں گھر سے کیوں نکلی تھی، دیکھتی کیا ہوں املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا "چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دیتے گئے تھے، کبوتر لے لو"۔ میں اس کے دام میں آگئی، ساتھ چلی گئی۔ جا کے دیکھتی ہوں، گھر میں کانی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی اُدھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دی۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا، مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا، وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا۔ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا، کوئی بس نہیں۔ موذی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہلی کے اندر مجھے گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اُڑے چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے، سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، دم نکلا جاتا تھا۔

آنکھوں سے باراں جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا تھا ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، مکان کا دالان، انگنائی، باورچی خانہ، سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا، مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں: دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا۔۔۔ تلملاتا پھرتا ہو گا۔

پیر بخش: بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمہیں قید ہوئے؟

دلاور خاں: پورے بارہ برس ہوئے بھائی! لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اُٹھائی ہیں، خیر۔۔۔ وہ اس۔۔۔ کو تو کوئی دن کو یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا، میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش: کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں: تم سمجھتے کیا ہو، جان سے نہ مارا ہو تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش: بھئی تم قول کے سچے ہو، جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلاور خاں: دیکھنا!

پیر بخش: اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں: کریں گے کیا، یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے، دل میں ایک دھچکا سا پہنچا، منکا ڈھل گیا، ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کر بھی موئے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش: اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلاور خاں: گلے گلے پانی۔

پیر بخش: کہاں سے دو گے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔

دلاور خاں: گھر تو چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کر دے دوں گا۔

پیر بخش: تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو، ہم نہ ایک بات بتائیں؟

دلاور خاں: کہو۔

پیر بخش: اماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھوکری کے کوڑے کرو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا، مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی یہ بات سن کے میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں: اچھا دیکھا جائے گا، ابھی تو چلے چلو۔

پیر بخش: یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں؟ وہ درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے، تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھر لیں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف بُرا ہوتا ہے۔ اک بار گی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرام زادی! چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا۔ فیل کرتی ہے۔۔۔"

پیر بخش: (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہو گا) نہیں بھئی نہیں۔ ایسا کام نہ کرنا، تمہیں ہمارے سر کی قسم! اماں ہمیں تو آلینے دو۔

دلاور خاں: اچھا جاؤ آگ لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا، دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں: (ایک کش حقے کا پی کر) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش: اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں! پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟

دلاور خاں: کریم؟

پیر بخش: ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا، لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔

دلاور خاں: آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش: کہاں ہے؟ لکھنؤ میں ہو گا۔ گومتی اس پار اس کی سسرال ہے، وہیں ہو گا۔

دلاور خاں: بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش: جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں: بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش: سو ڈیڑھ سو، جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں: بھائی کی باتیں! سو ڈیڑھ سو! اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی ملیں تو بہت ہے۔

پیر بخش: اچھا اس سے کیا ہے، لے تو چلو، مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا: "وہ تو ہم سمجھے ہی تھے، تم کیا ایسے بے وقوف ہو"۔

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ رقت سلب ہو گئی تھی، بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمبل اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کمبل سرکا کے جو دیکھا، معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا، سامنے کچھ کچے کچے مکان ہیں، ایک بنیے کی دکان ہے، دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسا کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے مجھ کو دیے۔ رات بھر کی بھوکی تھی، کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا، پھر چپکی ہو کے پڑی رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں ٹھہری رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے، دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا، گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی چھری نکلی، نہ مجھ پر گھونسے پڑے، نہ گھرکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے، باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے، کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے، دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے، سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہونے لگی، آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی سے کود پڑتا ہے، دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے، بات رفت گزشت ہوئی، ملاپ ہوا، دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک: ہمارے تمہارے لڑائی ہی کیا! بات کی بات تھی۔

دوسرا: بات ہی کیا تھی؟

پہلا: اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا: جانے دو۔

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے_ جاڑوں کی رات تھی، فضا سنّاٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھی سو۔ گھیسو نے کہا، "معلوم ہوتا ہے بچیگی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا، دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا، "مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں"

"تو بڑا بیدرد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بیوپھائی۔"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو اک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا۔ اسلئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا۔ اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے، یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی_ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے_ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔

کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکّل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر میں مٹّی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے، مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امّید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی۔ اور مادھو بھی سعادتمند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اِس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدّت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدّن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر، وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا، "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصّہ صاف کر دیگا۔ بولا، "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔،،

"ڈر کس بات کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی۔،،

"تو تمہیں جا کر دیکھو نہ۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں_ اور پھر مجھ سے لجائیگی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھڑا ہوا بدن دیکھوں! اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہو گی_ مجھے دیکھ لیگی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی_"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچّہ ہو گیا تو کیا ہو گا_ سونٹھ[wi34]، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔،،

"سب کچھ آ جائیگا۔ بھگوان بچّے دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دینگے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا۔ مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچّھی نہ تھی، اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجّب کی بات نہ تھی_ ہم تو کہین گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا_ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا_ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا_ اسلئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے، اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا_ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی_ اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے_

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصّہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا۔ لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصّہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے_ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔ اسلئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا، "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں سب کو۔ چھوٹے بڑے، سب نے پوڑیاں کھائیں، اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ۔ ایک رسیدار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا، کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول، مہکتی ہوئی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے_ پتّل[wi35] کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ دئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلّفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا، "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائیگا، وہ جمانا دوسرا تھا_ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی میں مت کھرچ کرو_ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھوگے! بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہونگی!"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔،،

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہونگی۔ اچّا پٹھّا[wi36] تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر، پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے بڑے اژدر گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکّھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت تھا۔ اس کے پیٹ میں بچّہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسمِ قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفّی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقعہ نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علّت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علّت میں۔ پوچھا، "کیا ہے بے گھسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نہیں نظر آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا، "سرکار بڑی بپت[wi37] میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک، تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹّی کون پار لگائیگا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹّی اٹھیگی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جائیں۔"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں، "چل، دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش۔" مگر یہ غصّہ یا انتقام کا موقعہ نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپئے نکال کر پھینک دئے۔ مگر تشفّی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپیہ دیے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرائت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈھورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دئے، کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپئے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلّہ دے دیا، کسی نے لکڑی۔ اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آ کر لاش کو دیکھتی تھیں، اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا، "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو۔"

مادھو بولا، "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہئے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائیگی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہئے۔"

"کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

"اور کیار کھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوادارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ کبھی اس بجاج کی دوکان پر گئے کبھی اس کی دوکان پر_ طرح طرح کے کپڑے، ریشمی اور سوتی، دیکھے، مگر کچھ جچا نہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتّفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے ۔اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے گدّی کے سامنے جا کر کہا، "ساہو جی ایک بوتل ہمیں بھی دینا۔" پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی، کچھ گزک۔ اس کے بعد کچھ چکھونہ آیا، تلی ہوئی مچھلی آئی۔ اور دونوں بر آمدے میں بیٹھ کر شراب پینے لگے۔

کئی کجّیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا، "کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان ک طرف دیکھ کر بولا، گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو، "دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ باہمنوں کو ہجاروں رپئے کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے، پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے !لوگ پوچھینگے نہیں، کپھن کہاں ہے !"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دینگے روپئے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا، ملے نہیں۔ لوگوں کو وشواس نہ آئیگا، لیکن پھر وہی روپیہ دینگے۔"

مادھو بھی ہنسا، اس غیر متوقّع خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر۔ بولا، "بڑی اچّھی تھی، بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی_ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں، گوشت اور سالن۔ اور چٹپٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتّلوں[wi38] میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپئے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا، "ہماری آتما پرسن[wi39] ہو رہی ہے تو کیا اسے پنّ نہ ہو گا؟"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی_ "جرور اسے جرور ہو گا۔ بھگوان، تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہر دے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا، "کیوں دادا، ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائینگے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔ وہ پرلوک کی باتیں سوچ کر اس آنند میں بادھا نہ ڈالنا چاہتا تھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے ؟"

"کہینگے تمہارا سر۔"

"پوچھیگی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملیگا؟ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے ! میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملیگا اور بہت اچھّا ملیگا ۔اس سے بہت اچھّا ملیگا جو ہم دیتے"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا، "کون دیگا؟ روپئے تو تم نے چٹ کر دئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملیگا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دیگا، بتاتے کیوں نہیں؟ وہ تو مجھ سے پوچھیگی۔ اس کی مانگ میں تو سندور میں نے ڈالا تھا۔"

"وہی لوگ دینگے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئینگے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئینگے۔ اور کپھن تیسری بار ملیگا۔"

جیوں جیوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانہ کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی_ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا_ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں الّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں، یا مردہ ہیں، یا زندہ در گور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوڑیوں کا پتّل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ [wi40] نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور دینے کے غرور اور مسرّت اور ولولہ کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا، "لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد [wi41] دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائیگا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، "بیکنتھ میں جائیگی دادا۔ بیکنتھ کی رانی بنے گی"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرّت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا، "ہاں بیٹا، بیکنتھ میں جائیگی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا [wi42] پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنتھ میں جائیگی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائینگے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں، اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلوّن [wi43] نشے کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا، "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ چیخیں مار مار کر۔

گھیسو نے سمجھایا، "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگی۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے [wi44]۔ ٹھگنی۔

سارا مے خانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے، ابھینے بھی کئیے، اور آخر نشے سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

نیا قانُون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اُس کی تعلیمی حیثیّت صفر کے برابر تھی اور اُس نے کبھی اسکول کا مُنہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اِس کے باوجود اُسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وُہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، اُستاد منگو کی وسیع معلُومات سے اچھّی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چِھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی تو اُس نے گاما چوہدری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبّرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا چوہدری! تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چوہدری نے اُس سے یہ پُوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا "ولایت میں اور کہاں"؟ اسپین میں جنگ چھڑی اور ہر شخص کو اُس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے پر جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقّہ پی رہے تھے، دِل ہی دِل میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُستاد منگو اُس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہُوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اُسی روز شام کے قریب جب وُہ اڈّے میں آیا تو اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہُوا تھا۔ حقّے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اُتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکّرانہ لہجے میں کہا۔ "یہ کسی پیر کی بددُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقُو چُھریاں چلتے رہتے ہیں اور مَیں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دُکھایا تھا اور اُس درویش نے جل کر یہ بددُعا دی تھی، جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔۔۔۔۔۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہُوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شُروع کی۔ "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وُہ روس والا جس کی بابت مَیں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے، لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ یہاں یہ کہنا بُھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددُعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اِس نفرت کا ایک سبب تو وُہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وُہ اُس کے ہندوستان پر اپنا سِکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظُلم ڈھاتے ہیں مگر اُس کے تنفّر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وُہ اُس کے ساتھ ایسا سلُوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کُتّا ہے۔ اِس کے علاوہ اُسے اُن کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وُہ گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں؟ وہ کہا کرتا تھا کہ اِن کے لال جھرّیوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وُہ لاش یاد آجاتی ہے جِس کے جسم پر سے اُوپر کی جِھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اُس کی طبیعت مکدر رہتی اور شام کو اڈّے میں آکر مار بل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقّے کے کش لگاتے ہُوئے اُس گورے کو جی بھر کر سُنایا کرتا۔

۔۔۔۔۔۔ یہ موٹی سی گالی دینے کے بعد وُہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔ "آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے اِن بندروں کی اولاد نے۔ رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم اِن کے باوا کے نوکر ہیں۔۔۔۔۔۔"

اِس پر بھی اُس کا غُصّہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اُس کا کوئی ساتھی اُس کے پاس بیٹھا رہتا وُہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔ "شکل دیکھتے ہو نا تُم اِس کی۔۔۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔۔۔ بالکل مُردہ، ایک دھپّے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم! پہلے پہل جی میں آئی کہ

ملعُون کی کھوپڑی کے پرزے اُڑادوں۔ لیکن اِس خیال سے ٹل گیا کہ اِس مردُود کو مارنا اپنی ہتک ہے۔"۔۔۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، اِن لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی اِن کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خُون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانُون وانون بنے تو اِن لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم! جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز اُستاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور اُن کی گُفتگو سے پتا چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اُس کی خُوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

وُہ مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے، گھر جاتے ہُوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سُنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانُون چلے گا۔۔۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کُچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مِل جائے گی۔"

کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانُون پاس ہو گا؟"

یہ پُوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خُوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اُس روز بار بار پیچھے مُڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھتی ہُوئی مُونچھوں کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہُوئے بڑے پیار سے کہتا۔ چل بیٹا۔ چل بیٹا۔۔۔۔۔۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو اُن کے ٹھکانے پُہنچا کر اُس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک ڈکار لی اور مُونچھوں کو مُنہ میں دبا کر اُن کو چُوستے ہُوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔ "ہت تیری ایسی کی تیسی"۔

شام کو جب وُہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمُول اُسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اُس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وُہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سُنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اِس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبُور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وُہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانُون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک نئی دُنیا میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اِس نئے قانُون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتّیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانُون پاس ہو گا؟" بار بار گُونج رہا تھا اور اُس کے تمام جسم میں مسّرت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اُس نے اُن مارواڑیوں کو گالی دی۔۔۔۔۔۔ "غریبوں کی کُٹھیا میں گھسے ہوئے کھٹل۔ نیا قانُون اُن کے لیے کھولتا ہُوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اُس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈک پُہنچی جب وُہ خیال کرتا کہ گوروں، سفید چوہوں (وہ اُن کو اِسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانُون کے آتے ہی ہمیشہ کے لیے بِلوں میں غائب ہو جائیں گی۔

جب نتّھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈّے میں داخل ہُوا تو اُستاد منگو بڑھ کر اُس سے مِلا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ لا ہاتھ اِدھر۔۔۔ ایسی خبر سُناؤں کہ جی خُوش ہو جائے۔ تیری اِس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔" یہ کہہ کر منگو نے بڑے۔۔۔ مزے لے لے کر نئے قانُون کے متعلق

اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو اُس نے کئی مرتبہ گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔ "تُو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضُرور کر کے رہے گا۔"

اُستاد منگو موجودہ سویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا اور اُسے وہاں کے نئے قانُون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اِسی لیے اُس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پُرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ اُنہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ اُستاد منگو نے اِس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانُون کے سات خلط ملط کر دیا تھا۔ اِس کے علاوہ جب کبھی وُہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو اِن تمام واقعات کو نئے قانُون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دِل ہی دِل میں بہت خُوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو بیرسٹر نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وُہ خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"جدید آئین کا دوسرا حصّہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دُنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریے کے اعتبار سے بھی فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

اُن بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، چونکہ اُس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اِس لیے اُستاد منگو صرف اُوپر کے جُملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اُس نے خیال کیا یہ لوگ ہندستان میں نئے قانُون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اُن کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اِس خیال کے زیرِ اثر اُس نے کئی مرتبہ اُن دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ "ٹوڈی بچّے!"

جب کبھی وُہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچّہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خُوش ہوتا تھا کہ اُس نے اُس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وُہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچّے" میں تمیز کرنے کی اہلیّت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وُہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اُس نے اُن تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا۔

"نئے آئین نے میری اُمید بڑھا دی ہے اگر۔۔۔۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضُرور مل جائے گی۔ ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اِسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں اُن میں کچھ تو کمی ہو گئی۔"

اِس گفتگو نے اُستاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیّت اور بھی بڑھا دی۔ اور وُہ اُس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانُون۔۔۔!" وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اُس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وُہ نیا ساز آ جاتا جو اُس نے دو برس ہُوئے چوہدری بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اِس ساز پر جب وُہ نیا تھا، جگہ جگہ لوہے کی نِکّل چڑھی ہُوئی کیلیں چمکتی تھیں۔ اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا، وُہ تو سونے کی طرح دھمکتا تھا۔ اِس لحاظ سے بھی "نئے قانُون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضُروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اُس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصوّر وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانُون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اُس کو یقین تھا کہ اُس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی، اُن سے اُس کی آنکھوں کو ضُرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے اُستاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جاکر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اُس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسُرور تھی۔ وُہ نئے قانُون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد دُھندلکے میں کئی تنگ اور کُھلے بازاروں کا چکّر لگایا مگر اُسے ہر چیز پُرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پُرانی۔ اُس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اُس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہُوئی تھی اور سب چیزیں پُرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اُس نے نئے قانُون کی خوشی میں اکتّیس مارچ کو خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اُس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہُوئے بجلی کے کھمبے، دُکانوں کے بورڈ، اُس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہُوئے گھنگھروں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔ اُن میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کوئی بھی نہیں، لیکن اُستاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دُکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اِس خیال سے اُسے تسکین تھی۔ اُس کے علاوہ وُہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد یہ کام شروع ہوتا ہے۔ اب اِس سے پہلے نئے قانُون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اُس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلباء کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خُوش پوش تھے۔ مگر اُستاد منگو کو نہ جانے اُن کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کُن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وُہ تھوڑی دیر کے بعد انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دُکانیں کُھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دُکانوں پر گاہکوں کی خُوب بِھیڑ تھی۔ بیناری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارے دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبُوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر اُستاد منگو کے لیے اِن تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔۔۔ وہ نئے قانُون کو دیکھنا چاہتا تھا ٹھیک اِسی طرح جس طرح وُہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچّہ ہونے والا تھا تو اُس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گُزارے تھے۔ اُس کو یقین تھا کہ بچّہ کسی نہ کسی دن ضُرور پیدا ہو گا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وُہ چاہتا تھا کہ اپنے بچّے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اُس کے بعد وُہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اِسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اُس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اُس کے اُوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچّے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اِس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

"تُو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تُو سمجھتی ہے کہ اِس طرح لیٹے لیٹے بچّہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہُوا تھا۔ وُہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسّس تھا۔ اُس کی بیوی کی گنگا دائی اُس کی اِس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔ "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا تُم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانُون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا اُسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانُون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ اُن کے جلوس کے ہنگاموں اور اُن کے گلے میں ڈالے ہُوئے پھُولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھُولوں سے لدا ہُوا ہوتا، اُستاد منگو کے نزدیک وُہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بِھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اُس کی نگاہوں میں وُہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانُون کو وُہ اپنے ذہن کے اِسی ترازُو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وُہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دُکان کے پاس اُسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اُس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دِل میں یہ خیال کیا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہُوا۔۔۔ شاید چھاؤنی ہی میں سے نئے قانُون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پُہنچ کر اُستاد منگو نے سواری کو اُس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو اُنگلیوں میں دبا کر سُلگایا اور اگلی نشست کے گدّے پر بیٹھ گیا۔ جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہُوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وُہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اُس کا گھوڑا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اُسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھُٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور اُستاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سُست تھی۔ جِس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا اُسی طرح اُستاد منگو کے ذہن میں نئے قانُون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وُہ نئے قانُون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اِس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلُوم ہُوا جیسے کسی سواری نے اُسے بُلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اُسے سڑک کے اُس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اُسے ہاتھ سے بُلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اُستاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا "اِن کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں، اِس کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اُس نے گھوڑے کو چابک دِکھایا اور آنکھ جھپکتے میں وُہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اُس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پُوچھا۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟" اِس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اُس کا اُوپر کا مُونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا اور پاس ہی گال کے اُس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصّے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اُس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اُس نے اِس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہَوا کا رُخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا، مُڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک اُستاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اُڑ گئیں۔ اُستاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا، اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا، گویا وہ اُس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا، گویا وُہ اُستاد منگو کے اِس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دُھواں نگلتے ہُوئے کہا۔ "جانا مانگٹا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟" "وہی ہے۔" یہ لفظ اُستاد منگو کے ذہن میں پیدا ہُوئے اور اُس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔ "وہی ہے" اُس نے یہ لفظ اپنے مُنہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اُسے پُورا یقین ہو گیا کہ وُہ گورا جو اُس کے سامنے کھڑا تھا، وہی ہے جس سے پچھلے برس اُس کی جھڑپ ہُوئی تھی اور اُس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی شراب تھی، اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ دُرست کر دیا ہوتا بلکہ اُس کے پرزے اُڑا دیئے ہوتے۔ مگر وُہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اِس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانُون پر غور کرتے ہُوئے گورے سے کہا۔ "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک جیسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"

"کرایہ پانچ روپے ہو گا۔" اُستاد منگو کی مُونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران رہ گیا۔ وُہ چِلّایا "پانچ روپے۔ کیا تُم۔۔۔"

"ہاں، ہاں پانچ روپے۔" یہ کہتے ہُوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔

"کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وُہ خیال کر رہا تھا کہ اُس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اِس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وُہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہُوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چُھوئی۔ اُس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وُہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکّا دے کر اُس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیّر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر اُستاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اُس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اُس کی آنکھوں سے شرارے برس رہے ہیں تو اُس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اُس کی چیخ و پکار نے اُستاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وُہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا۔ "پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچّہ؟"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مُشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ اُستاد منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی چوڑی چھاتی پُھولی ہُوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ مُنہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہُوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وُہ ہانپتی ہوئی آواز سے کہہ رہا تھا۔ "وہ دن گُزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانُون ہے میاں۔ نیا قانُون!"

وہ بیچارہ گورا اپنے بِگڑے ہُوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجُوم کی طرف۔

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانُون، نیا قانُون" چِلّاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔ "نیا قانُون، نیا قانُون، کیا بک رہے ہو۔ قانُون وہی ہے پُرانا!" اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

فینسی ہیئر کٹنگ سیلون

آبادیوں کی ادل بدل نے ایک دن ایک اجنبی شہر میں چار حجاموں کو اکٹھا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹی سی دکان پر چائے پینے آئے۔ جیسا کہ مثال ہے، ہم پیشہ لوگ جلد ہی ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بہت جلد ایک دوسرے کو جان گئے۔ چاروں وطن سے لٹ لٹا کر آئے تھے۔ جب اپنی اپنی بپتا سنا چکے تو سوچنے لگے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ تھوڑی تھوڑی سی پونجی اور اپنی اپنی کسبت ہر ایک کے پاس تھی ہی۔ صلاح ٹھہری کہ چاروں مل کر ایک دکان لیں اور ساجھے میں کام شروع کر دیں۔

یہ تقسیم کے آغاز کا زمانہ تھا۔ شہروں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دلجمعی سے کوئی کام نہ کر پاتے تھے۔ تمام کاروبار سرد پڑے ہوئے تھے، پھر بھی اُن حجاموں کو دکان کے لیے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ وہ کئی دن تک سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے اور چھوٹے چھوٹے افسروں، کلرکوں اور چپراسیوں تک کو اپنی دکھ بھری کہانی بڑھا چڑھا کر سناتے رہے۔ آخر کار ایک افسر کا دل پسیج گیا اور اس نے ان چاروں کو شہر کے ایک اہم چوک میں ایک حجام ہی کی دکان دلا دی جو ہنگامہ کے دنوں میں تالا ڈال کر بھاگ گیا تھا۔

یہ دکان زیادہ بڑی تو نہ تھی، پر اس کے مالک نے اس میں اچھا خاصا سیلونوں کا سا ٹھاٹھ باٹھ کر رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے جوڑ اوپر سنگِ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جما، ٹیبل سے بنا لیے تھے۔ تین ایک طرف اور دو ایک طرف۔ ہر ایک ٹیبل کے ساتھ دیوار میں جڑا ہوا ایک بڑا آئینہ تھا اور ایک اونچے پایوں کی کرسی جس کے پیچھے لکڑی کا گدی دار سٹینڈ لگا ہوا تھا۔ گاہک ٹھگنے قد کا ہوا تو اسٹینڈ کو نیچے سرکا لیا، لمبے قد کا ہوا تو اونچا کر لیا اور گدی پر اس کے سر کو ٹکا کر مزے سے ڈاڑھی مونڈنے لگے۔

ضرورت کی یہ سب چیزیں مہیا تو تھیں مگر تھیں ذرا پرانے فیشن کی اور ٹوٹی پھوٹی سنگ مرمر کی سلوں کے کنارے اور کونے جگہ جگہ سے شکستہ تھے۔ آئینے تھے تو بڑے بڑے مگر ذرا پتلے، اس کی وجہ سے گاہکوں کو اپنی صورتیں چپٹی چپٹی سی نظر آتی تھیں۔ ایک آئینے کے بیچ میں کچھ اس طرح بل پڑ گیا تھا کہ دیکھنے والے کو اس میں بیک وقت ایک کے دو چہرے نظر آتے مگر دونوں ادھورے جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر مضحکہ خیز صورت پیدا کرتے۔ چنانچہ اس آئینے کے سامنے بیٹھنے والا اپنی گردن کو تین چار مرتبہ مختلف زاویوں پر اونچا نیچا کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ علاوہ ازیں اس دکان میں شیمپو کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

لیکن حجاموں نے ان خامیوں کا کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات ان کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ ایک دن انھیں یہ سب سامان بنا بنایا، مفت مل جائے گا۔ اپنے وطن میں وہ اب تک بڑی گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ ان میں ایک جو عمر میں سب سے بڑا تھا اور استاد کہلاتا تھا اس نے کچھ مستقل گاہک باندھ رکھے تھے جن کے گھر وہ ہر روز ایک دن چھوڑ کر ڈاڑھی مونڈنے جایا کرتا تھا۔

اس سے عمر میں دوسرے درجے پر جو حجام تھا اس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لاریوں کے اڈے بنا رکھے تھے۔ دن بھر کسبت گلے میں ڈالے ڈاڑھی بڑوں کی ٹوہ میں رہا کرتا اور دوسرے دو حجام جو نو عمر تھے ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو روپیہ یومیہ پر کبھی کسی دکان میں تو کبھی کسی دکان میں کام کیا کرتے تھے۔ اب اچانک قسمت نے ان لوگوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی اور خود مختاری کا یہ موقع جو بخشا تو وہ بہت خوش ہوئے اور دکان کو اور زیادہ ترقی دینے اور اپنی حالت کو سنوارنے پر کمربستہ ہو گئے۔

سب سے پہلے ان لوگوں نے بازار سے ایک کوچی اور چونا لا کر خود ہی دکان میں سفیدی کی اور اس کے فرش کو خوب دھویا پونچھا۔ اس کے بعد نیلام گھر سے پرانے انگریزی کپڑوں کے دو تین گٹھڑ سستے داموں خریدے، ان میں سے قمیصوں اور پتلونوں کو چھانٹ کر الگ کیا۔ پھٹے کپڑوں کو سیا۔ جہاں جہاں پیوند لگانے کی ضرورت تھی وہاں پیوند کاری کی۔ جن حصوں کو چھوٹا کرنا تھا ان کو چھوٹا کیا اور یوں ہر ایک نے اپنے لیے دو دو تین تین جوڑے تیار کر لیے۔

اس کے علاوہ ہر ایک کو ایک ایک چادر کی بھی ضرورت تھی جسے بال کاٹنے کے وقت گاہک کے جسم پر گردن کے نیچے لپیٹنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام تھا، مگر ان لوگوں نے شالوں، جمپروں، کوٹوں اور پتلونوں کو پھاڑ کر جیسے تیسے دو چادریں بنا ہی لیں۔ کپڑوں کے اسی ڈھیر میں انھیں ریشم کا سیاہ پردہ بھی ملا جس پر سنہرے رنگ میں تتلیاں بنی ہوئی تھیں، کپڑا تھا تو بوسیدہ مگر ابھی تک اس میں چمک دمک باقی تھی۔ اسے احتیاط سے دھو کر دکان کے دروازے پر لٹکا دیا۔

اپنے اپنے اوزار سب کے پاس تھے ہی، ان کی تو فکر نہ تھی، البتہ تھوڑے تھوڑے داموں والی کئی چیزیں خریدی گئیں مثلاً سلولائڈ کے پیالے صابن کے لیے، ڈاڑھی کے برش، پھٹکری، چھوٹی بڑی کنگھیاں، تولیے، دو تین تیز خوشبو والے دیسی تیلوں کی شیشیاں، ایک گھٹیا درجے کی کریم کی شیشی، ایک سستا سا پوڈر کا ڈبہ۔ علاوہ ازیں کباڑیوں کی دکانوں سے ولایتی لونڈر کی ٹیڑھی ترچھی خالی شیشیاں خرید ان میں سرسوں کا تیل بھر دیا۔

دکان کی آرایش کی طرف سے بھی یہ لوگ غافل نہ رہے۔ دکان کے پہلے مالک نے اس میں نہ جانے کس زمانے کی دقیانوسی مذہبی تصویریں لٹکا رکھی تھیں، ان کو اتار ڈالا اور ان کی جگہ دو ایک پرانے امریکن فلموں کے بڑے بڑے رنگدار پوسٹر جو ایک کباڑیے کے ہاں سے لے آئے تھے، دکان کے اندر دیواروں پر چسپاں کر دیے۔ علاوہ ازیں دو تین قطعات اور ایک کیلنڈر جس میں ملک کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے فوٹو تھے، دیوار پر ٹانگ دیے۔ دکان کو جلد چلانے کے خیال سے انھوں نے اجرتیں بہت کم رکھیں۔ مروجہ اجرتوں کے نصف سے کم، چنانچہ ایک گتے پر سیاہ روشنائی سے حجامت کی اجرتیں لکھوا کر اسے دیوار پر ایسی جگہ لٹکا دیا کہ گاہک جیسے ہی دکان میں داخل ہو اس کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔

پہلے حجام نے اس دکان کا نام ”فینسی ہیئر کٹنگ سیلون“ رکھا تھا۔ یہ نام دکان کی پیشانی پر جلی حروف میں انگریزی اور اردو زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ ایک بابو سے ”فینسی“ کا مطلب معلوم کر کے بہت خوش ہوئے اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسی سے کام لیا جائے۔ کوئی نیا نام رکھتے تو اس کو مٹانے اور اس کو لکھوانے پر خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی۔

جس روز باقاعدہ طور پر دکان کا افتتاح ہونا تھا، انھوں نے دوپہر کو بڑی محنت سے ایک دوسرے کی حجامتیں بنائیں، لمبی لمبی قلمیں رکھیں۔

گرم پانی سے خوب مل مل کر نہائے، صاف ستھری قمیصیں اور پتلونیں پہنیں، جن کو انھوں نے قریب کی ایک لانڈری سے دھلوایا تھا۔ بالوں میں تیل ڈالا، پٹیاں جمائیں، گردن اور چہرے پر ہلکا ہلکا پوڈر ملا اور یوں چاق و چوبند ہو، اگر بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو میں، استروں کو، جن کی دھار وہ رات بھر سِلوں پر تیز کرتے رہے تھے، ہتھیلیوں پر ہلکا ہلکا پٹکتے ہوئے خود کو خدمت خلق کے لیے پیش کر دیا۔

پہلی شام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کل پانچ گاہک آئے، تین شیو اور دو بال کٹائی کے اور وہ بھی آدھ آدھ پاؤ پاؤ گھنٹے کے وقفے پر مگر یہ لوگ ذرا مایوس نہ ہوئے۔ ہر گاہک کا پُرجوش خیر مقدم کیا، اس کو بٹھانے سے پہلے کرسی کو دو بار جھاڑا پونچھا۔ اس کی ٹوپی پگڑی یا کوٹ لے کر احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ ڈاڑھی کے بال نرم کرنے کے لیے دیر تک برش سے جھاگ کو پھینٹا، بڑے نرم ہاتھ سے استرا چلایا اور اگر احتیاط کے باوجود کہیں ہلکا سا چرکا لگ بھی گیا تو بڑی چابک دستی سے خون کو صابن کے جھاگ میں چھپائے رکھا تاوقتیکہ پوری ڈاڑھی نہ مونڈلی اور پھر اطمینان سے پھٹکری پھیر کر زخم کو نیست و نابود کر دیا۔

ایک حجام نے اس خیال سے کہ بال کاٹنے میں زیادہ وقت لگایا جائے تو گاہک خوش ہوتا ہے، ایک دفعہ بال تراش کر دوبارہ تراشنے شروع کر دیے۔ آخر میں اس نے گاہک کے سر میں تیل ڈال یوں ہلکے ہلکے مزے سے ملنا شروع کیا کہ گاہک کی آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کو محنت کا صلہ جلد ہی مل گیا۔ گاہک نے اجرت کے علاوہ ایک آنہ اسے ”بخشیش“ کے طور پر بھی دیا۔ اس شام کام کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے دیر تک دکان کھلی رکھی، پھر دکان بڑھانے کے بعد بھی وہ دیر تک جاگتے رہے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن دفتروں میں کوئی تعطیل تھی۔ صبح کو آٹھ بجے ہی سے گاہک آنے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد تو یہ کیفیت ہو گئی کہ ایک گیا نہیں کہ دوسرا آ گیا، پھر بعض دفعہ تو تین تین کاریگر بیک وقت کام میں مصروف رہے۔ رات کو دکان بڑھا کر حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں تقریباً چار چار روپے آئے۔ تیسرے روز پھر مندا رہا مگر چوتھے روز پھر گاہکوں کی گہما گہمی دیکھ کر چاروں کو یقین ہو گیا کہ دکان قطعی طور پر چل نکلی ہے۔ یہ لوگ اس اجنبی شہر میں اکیلے ہی

آئے تھے لہٰذا رات کو فرش پر بستر جما دکان ہی میں پڑے رہتے۔ ایک چھوٹی سی انگیٹھی، ایک کیتلی اور دو تین روغنی پرچ پیالیاں خرید لیں۔ صبح کو دکان ہی میں چائے بناتے اور ناشتہ کرتے، دوپہر کو تنور سے دو ایک قسم کے سالن اور روٹیاں لے آتے اور چاروں مل کر پیٹ بھرتے۔

دکان کو قائم ہوئے ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن سہ پہر کو ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا شریف صورت آدمی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے میلے تھے، مگر پھٹے ہوئے نہ تھے۔ سر پر اس وضع کی پگڑی جیسے منشی لوگ باندھا کرتے ہیں، پاؤں میں نری کا جوتا۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس میں سفید بال زیادہ ہیں یا کالے۔ ایک گھٹیا درجے کی عینک لگائے ہوئے تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے دھاگے سے جوڑ رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ جھجکا مگر پھر بیٹھ گیا۔

ایک حجام نے پوچھا، "شیو؟"

اس نے کہا، "نہیں۔"

"بال؟"

"نہیں۔"

"اور پھر کیا چاہتے ہو؟" استاد نے پوچھا۔

"مہربانی کر کے میرے ناخن کاٹ دو۔" اس نے کہا۔

ناخن کٹوانے کے بعد بھی وہ شخص وہیں بیٹھا رہا۔ آخر جب ان لوگوں نے بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہنا شروع کیا۔
"صاحب میں ایک غریب مہاجر ہوں، میں اپنے وطن میں ایک بنیے کا منشی تھا اس کے ہاں راشن کارڈوں کی پرچیاں لکھا کرتا تھا اور حساب کتاب کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ وطن چھوٹا تو یہ روزگار بھی چھوٹ گیا۔ اس شہر میں کئی دن سے بے کار پھر رہا ہوں، کئی جگہ نوکری کی تلاش میں گیا مگر ہر جگہ پہلے ہی سے منشی موجود تھے۔ اگر آپ مجھے کوئی کام دلوا دیں تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گا۔ میں اس بے کاری سے ایسا تنگ آ گیا ہوں کہ جو کام بھی آپ مجھے بتائیں گے دل و جان سے کروں گا۔ حساب کتاب کے کام کے علاوہ میں کھانا پکانا بھی جانتا ہوں۔"

اس کی بات سن کر تھوڑی دیر یہ لوگ خاموش رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ آخر استاد نے زبان کھولی: "دیکھو میاں! ہم خود مہاجر ہیں اور نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ تنخواہ تو ہم تم کو دینے کے نہیں، ہاں کھانا دونوں وقت ہمارے ساتھ کھاؤ بلکہ خود ہی پکاؤ کیونکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ بس تھوڑا سا اپنی دکان کو جھاڑ پونچھ دیا کرنا۔ پھر جب کہیں تمھارا کام بن جائے تو شوق سے چلے جانا، ہم روکیں گے نہیں۔" اس شخص نے بڑی خوشی سے ان کی یہ شرط منظور کر لی۔ شکریہ ادا کیا اور وہیں رہ پڑا۔

دوسرے دن بازار سے ایلومینیم کی ایک دیگچی اور کچھ اور برتن خریدے گئے اور دکان میں ہنڈیا پکنے کا سامان ہونے لگا مگر پہلے ہی روز ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ شخص کھانا پکانا کچھ واجبی سا ہی جانتا ہے تاہم اسے نکالا نہیں گیا۔ جھاڑنے پونچھنے میں وہ کافی چست تھا۔ بازار سے سودا بھی دوڑ کر لے آتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ایک شخص جو آٹھ پہر غلامی کرنے کو تیار تھا، خط پتر لکھ سکتا تھا، حساب کتاب جانتا تھا، آقاؤں سے ادب سے پیش آتا تھا دو وقت کی روٹی پر کچھ مہنگا نہ تھا۔ یوں ہی دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ دکان کھلے دو مہینے ہو گئے۔ اس عرصے میں دکان نے خاصی ترقی بھی کر لی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے لیے کچھ نیا فرنیچر بھی خرید لیا تھا۔ شیمپو کے لیے بیسن وغیرہ بھی لگوا لیا تھا اور تھوڑی تھوڑی رقم ہر ایک نے بچا بھی لی تھی۔

تیسرا مہینہ ابھی آدھا گزرا تھا کہ ایک صبح ہی صبح استاد کو اپنے بیوی بچوں کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لینے لگا۔ تیسرے پہر اس کی اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے چار دن کی چھٹی لی اور بیوی بچوں کو لے آنے کے لیے روانہ ہو گیا جو کوئی ۲۰۰ میل دور کسی شہر میں اپنے کسی رشتہ دار کے دروازے پر ناخواندہ مہمان بنے پڑے تھے۔

استاد نے چار دن میں لوٹ آنے کا پکا وعدہ کیا تھا اور بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں مگر واپسی میں پورے پندرہ دن لگ گئے۔ بیوی بچوں کو تو اسٹیشن کے مسافر خانے ہی میں چھوڑا اور خود دکان پر جا پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بیماریوں کی ایک طویل داستان سنائی جن میں اس کی بیوی اور چار بچے مبتلا تھے اور وہ تکلیفیں بھی بیان کیں جو بیوی بچوں کو یہاں تک لانے میں اسے اٹھانی پڑیں۔ آخر میں اس نے خرچ سے تنگی کا ذکر کیا اور روپیہ قرض مانگا۔

یہ بات تو ظاہر ہی تھی کہ جتنے روز استاد نے دکان میں کام نہیں کیا تھا اتنے روز کی آمدنی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا اور ایک کاریگر کے کم ہونے سے آمدنی بھی نسبتاً کم ہی ہوئی تھی مگر کچھ تو بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اور کچھ مروت کی وجہ سے اس کے ساتھیوں نے اسے یہ بات نہ جتائی بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ پندرہ روپے استاد کی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھے مگر وہ چپ چاپ یہ رقم لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن سے پھر چاروں آدمی کام کرنے لگے۔ تب تک تو ان کا یہ قاعدہ رہا تھا کہ گاہکوں سے اجرتیں لے لے کر اپنے پاس ہی جمع کرتے رہتے اور رات کو دکان بڑھاتے وقت ساری رقم اکٹھی کر کے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے۔ دکان کے رکھ رکھاؤ، ٹوٹ پھوٹ اور اپنے اور نوکر کے کھانے پینے پر جو رقم خرچ ہوتی اس میں وہ چاروں برابر کے ساجھی تھے مگر استاد نے دوسرے ہی دن باتوں باتوں میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ بھئی میں بیوی بچوں والا ہوں، پردیس کا معاملہ ہے، ان کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں، اس لیے رات کو میں ان کے پاس سویا کروں گا، دوسرے یہ کہ کھانا بھی میں ان کے ساتھ ہی کھایا کروں گا۔ آج سے تم کھانے پینے کے خرچ میں سے میرا نام نکال دو

اور بھائیو! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اِدھر تو تمھارے ساتھ خرچ کروں اور اُدھر گھر پر بھی۔ اس کے ساتھی یہ بات سن کر خاموش ہو رہے۔ اب استاد دوپہر کو کھانا کھانے گھر چلا جاتا جو اس نے قریب ہی کہیں لے لیا تھا دو گھنٹے بعد لوٹتا۔ رات کو بھی وہ جلد دکان بڑھوا، اپنا حصہ لے، چلتا بنتا۔ کوئی ہفتہ بھر تک یہی سلسلہ رہا مگر اس کے بعد استاد کے تینوں ساتھیوں کے طور ایک دم سے بدل گئے۔ اب وہ اکثر آپس میں کھسر پھسر کرتے اور چپکے چپکے استاد کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہتے۔ خصوصاً اس وقت جب حجامت کے بعد گاہک سے استاد اُجرت وصول کرتا وہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے کہ استاد پیسے کس جیب میں ڈالتا ہے۔

ایک رات جب استاد دکان سے رخصت ہوا تو اس کے تینوں ساتھی دیر تک جاگتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ انھیں استاد کے خلاف کئی شکایتیں تھیں جنھیں وہ اب تک بڑے صبر سے درگزر کرتے رہے تھے مگر اب، جب اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ استاد روپے پیسوں کے معاملے میں بھی کھرا نہیں ہے تو وہ صبر نہ کر سکے۔ انھوں نے استاد کی اس دھوکہ بازی کی روک تھام کے لیے بہت سی تجویزیں سوچیں مگر کسی پر دل نہ جما، آخر بڑی رات گئے ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی اور وہ اطمینان سے سو گئے۔

دوسرے دن جب استاد دکان پر آیا تو ان تینوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا، ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: "میں نے خود اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رات تم نے گاہک سے چونی لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لی حالانکہ سارے پیسے تم اپنی قمیص کی جیب میں ڈالا کرتے ہو۔" دوسرے نے کہا، "تم بکتے ہو۔ تم خود پکے بے ایمان ہو۔ پرسوں گاہک نے تمھیں ایک دونّی اور دو اکنّیاں دی تھیں۔ ایک دونّی اور ایک اکنّی تو تم نے جیب میں ڈال لی اور ایک اکنّی چالاکی سے انگلیوں کے بیچ ہی دبائے رکھی۔"

اس پر تیسرے نے کہا "ارے میاں لڑتے جھگڑتے کیوں ہو، جو ہوا اس کو تو کرو معاف، آیندہ کے لیے میں تمھیں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی چاہے بھی تو اس قسم کا دھوکا نہیں کر سکے گا، وہ یہ کہ دروازے کے قریب میز کرسی ڈال دو۔ کرسی پر تو منشی کو بٹھا دو اور میز پر ایک صندوقچی رکھ دو جس کے ڈھکنے میں سوراخ ہو۔ بس گاہک حجامت کے پیسے اس صندوقچی میں خود ہی ڈال دیا کرے۔ ہم میں کوئی خود ایک پائی بھی وصول نہ کرے۔ منشی مفت میں روٹیاں بٹورا کرتا ہے اس سے یہ کام کیوں نہ لیا جائے۔ یہ اس بات کا بھی دھیان رکھے گا کہ کوئی شخص بغیر اجرت دیے نہ چلا جائے یا کھوٹے سکے نہ دے دے۔ پھر چاہو تو منشی ساتھ ساتھ کاپی میں رقمیں بھی لکھتا جائے گا۔ آخر کس لیے رکھا ہے اس کو!"

اس پر پہلے نے کہا، "بہت ٹھیک۔ مجھے منظور ہے لیکن یہ نہیں مانے گا، بے ایمانی جو ٹھہری جی میں۔"

اس پر دوسرے نے بھنّا کر کہا، "کیوں میں کیوں نہ مانوں گا۔ اچھا ہے ایسا ہو جائے۔ جھوٹ سچ آپ ظاہر ہو جائے گا۔"

تیسرے نے استاد سے پوچھا، "کیوں استاد تمھاری کیا رائے ہے؟"

استاد کچھ نہ کہہ سکا۔ نہ اس تجویز کے حق میں نہ اس کے خلاف۔ اس نے خاموش ہی رہنے میں مصلحت سمجھی۔

دوسرے ہی دن سے اس تجویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ہر روز رات کو دن بھر کی آمدنی کا باقاعدہ حساب ہوتا اور اس میں سے ہر ایک کو پورا پورا حصہ ملتا۔ چار دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی کہ آمدنی کا حصہ بجز اروزانہ کے بجائے ہفتہ بعد کیا جائے، اس روز ہر شخص کو معقول رقم مل سکے گی۔ ہر روز جو تھوڑے تھوڑے پیسے ملتے ہیں ان سے تو کسی کی بھی پوری نہیں پڑتی۔ ہاں اگر ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی ساجھے دار کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ جائے تو وہ منشی سے پرچی لکھوا کر پیشگی لے سکتا ہے۔ استاد نے اس کی بھی مخالفت نہ کی نہ موافقت کی۔ وہ خاموش ہی رہا۔ مگر استاد اپنی خاموشی کو زیادہ دن قائم نہ رکھ سکا۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح دکان پر آ پہنچا اور چھوٹے پر استرے کی دھار گھسیٹتے ہوئے ایک دم اپنے ساتھیوں پر برس پڑا:

"بس جی بس! میں تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ انصاف کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے۔ تم نے گدھے گھوڑے کو برابر سمجھ لیا ہے۔ تم میں سے نہ تو کوئی میرے جتنا پرانا کاریگر ہے اور نہ ہنر مند، پھر ڈاڑھی مونڈنے میں میرا ہاتھ ایسا ہلکا ہے کہ ہر شخص مجھی سے ڈاڑھی منڈانا چاہتا ہے۔ میں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں کہ جب کام میں مصروف ہوتا ہوں تو وہ دکان میں آتے ہی نہیں۔ بلکہ باہر ہی باہر ٹہلتے رہتے ہیں کہ دوسرے سے ڈاڑھی نہ منڈانی پڑ جائے، پھر جہاں مجھے خالی ہوتے دیکھتے ہیں، لپک کر میری کرسی پر آ بیٹھتے ہیں۔ منشی اس بات کا گواہ ہے کہ میری روز کی کمائی تم لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب میں ہنر میں بھی تم سے بڑھ کر ہوں اور گاہک بھی زیادہ میرے ہی پاس آئیں۔

کام بھی زیادہ میں ہی کروں، کمائی بھی زیادہ میری ہی ہو، تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مجھے بھی اتنا ہی ملے جتنا تم سب کو ملتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم لوگ میرا حصہ مجھے دے دو اور دکان خود سنبھال لو۔ اگر یہ نہیں تو کام کے لحاظ سے ہر ایک کی تنخواہ مقرر کر دو۔ آمدنی میں سے تنخواہیں نکال کر جتنی رقم بچے گی وہ ہم چاروں آپس میں برابر برابر بانٹ لیا کریں گے۔ اگر تم کو یہ بات منظور ہو تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں، ورنہ صاحب ایسی دکان اور ایسی ساجھے داری کو میرا دور ہی سے سلام۔ بندہ کہیں اور قسمت آزمائے گا۔ جتنے پیسے مجھے یہاں ملتے ہیں اس سے زیادہ تو میں آنکھ بند کر کے جس سیلون میں چلا جاؤں، لے سکتا ہوں۔"

استاد کی یہ تقریر اس کے تینوں ساجھیوں نے بہت غور اور توجہ سے سنی۔ اس میں کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں مثلاً ہنر مندی میں استاد واقعی ان تینوں سے کہیں بڑھ کر تھا مگر اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ ساجھے داری میں اپنی ہنر مندی کا ناجائز دباؤ ڈالے۔ جب ساجھا ہی ٹھہرا تو ہنر مندی کی کون پروا کرتا ہے۔ ساجھا ایک کنبہ کی طرح ہے جس میں کمانے والے فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق کنبہ کی پرورش کرتے ہیں۔ کم و بیش کمانے والوں یا نہ کمانے والوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی اور یہ استاد کی حد درجہ کم ظرفی ہے کہ وہ زیادہ ہنر مند اور کم ہنر مند کا سوال اٹھا کر ساجھے میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

استاد کی دکان سے قطع تعلق کر لینے کا مطلب بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بھاری رقم بطور معاوضہ استاد کو دینا اور یہ رقم ان کے پاس نہ تھی، دوسری صورت یہ تھی کہ یہ تینوں دکان سے علاحدہ ہو جاتے مگر علاحدہ ہو کر جاتے تو کہاں جاتے۔ نہ کام ہی میں ایسی مہارت تھی کہ دوسری جگہ آسانی سے نوکری مل سکتی اور نہ سر چھپانے ہی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ لہٰذا گلے شکوے تو انھوں نے بہت کیے مگر انجام کار انھوں نے استاد کی تنخواہوں والی شرط مان ہی لی۔ تنخواہیں مقرر کرنے کے مسئلے نے خاصا طول کھینچا، آخر بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ استاد کو تو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملے اور اس سے نچلے کاریگر کو ایک سو بیس، تیسرے کو سو اور چوتھے کو اسّی۔ ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ تنخواہوں کا حساب مہینے کے مہینے ہوا کرے۔

استاد دل میں بہت خوش تھا کہ بالآخر اس نے اپنا تفوّق اپنے ساتھیوں پر قائم کر لیا۔ ادھر اس کے ساتھی کچھ دن پژمردہ رہے مگر پھر مہینے کے بعد ایک معقول رقم ہاتھ آنے کے خیال نے رفتہ رفتہ ان کا غم دور کر دیا اور وہ بڑی بے تابی سے مہینہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ کا دن آیا تو یہ دیکھ کر ان چاروں حجاموں کی حیرانی اور مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ پچھلے مہینے دکان سے جو آمدنی ہوئی تھی اس میں سے ان کی آدھی آدھی

تنخواہیں بھی نہیں نکلتی تھیں۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا اس بات پر ہوا کہ دکان پہلے سے زیادہ ترقی پر تھی۔ گاہک بھی پہلے سے زیادہ آرہے تھے مگر اس کے باوجود انھیں جو رقم ملی اس کا یومیہ ابتدائی دنوں کے یومیہ سے بھی کم تھا۔ منشی کے کھاتے کی جانچ پڑتال کی گئی مگر اس نے پائی پائی کا حساب بتا دیا۔

ہر شخص کی روز کی کمائی، چاروں کی روز کی کمائی، ہفتہ کی کمائی، مہینہ کی کمائی الگ الگ بھی اور مشترکہ بھی۔ پورا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ کیا مجال جو کوئی شخص اس کے حساب میں غلطی نکال سکے۔ قاعدہ ہے کہ روپیہ باہر آنے والا ہو یا بندھی ہوئی تنخواہ ہو تو انسان خواہ مخواہ اپنا خرچ بڑھا لیتا ہے، یا اس کے بھروسے قرض لے لیتا ہے۔ ان میں سے دو حجام، ایک استاد اسی امید پر محلے کے بعض دکان داروں کے مقروض ہو گئے۔ قرض خواہ کے تقاضے کا ڈر تو تھا ہی، آئندہ قرض کا دروازہ بند ہو جانے کا بھی احتمال تھا۔

اس روز رات کو جب وہ دکان بڑھانے لگے تو حد درجہ شکستہ دل اور مایوس نظر آتے تھے۔ سب سے زیادہ مسکین پن منشی کے چہرے سے ٹپک رہا تھا، ہر چند اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی، پھر بھی اپنے آقاؤں کی اس مصیبت میں وہ برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آیا اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں جھجک جھجک کر کہنے لگا: ”آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے میں عمر بھر اسے نہیں بھول سکتا۔ آج آپ کو پریشان دیکھ کر میرا دل بے حد کڑھا ہے۔ اب میں آپ کو سچی بات بتاتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جب میں اپنے وطن میں بنیے کے ہاں نوکر تھا تو ہر مہینے تنگی ترشی کر کے اپنی تنخواہ میں سے کچھ روپے بچا لیا کرتا تھا۔

چند مہینے میں خاصی پونجی جمع ہو گئی، وطن سے چلتے وقت ساتھ لیتا آیا اور یہاں ڈاکخانے میں جمع کرا دیا کہ آڑے وقت میں میرے کام آئے... مگر اب آپ کو پریشان دیکھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے پاس روپیہ ہو اور میں اسے اپنے بھائیوں سے چھپائے رکھوں... اگر آپ کہیں تو کل میں ڈاکخانے سے اپنا روپیہ نکال لاؤں۔ آپ اسے کام میں لائیے جب دکان کی آمدنی بڑھ جائے تو مجھے لوٹا دینا۔ میں کوئی نفع نہیں لوں گا۔ ”تمھارے پاس کتنے روپیہ ہیں؟“ حجاموں نے پوچھا۔ کچھ تامل کے بعد منشی نے دھیرے سے کہا، ”۱۰۰ روپے!“

دوسرے دن منشی ڈاک خانے سے سو روپے نکال لایا، اور ان سے الگ الگ رسید لے کر وہ رقم ان میں تقسیم کر دی۔ اس طرح ان کی پریشانیاں کسی قدر دور ہو گئیں مگر اگلے مہینے دکان میں اس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ تب تو یہ لوگ بہت ہی گھبرائے۔ منشی نے بڑی چھان بین کے بعد آمدنی کے کم ہونے کی یہ وجہ دریافت کی کہ چونکہ چوک کے دوسرے ہیئر کٹنگ سیلونوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی یا مندے کی وجہ سے اپنے ہاں اجرتیں کم کر دی ہیں، اس لیے وہ گاہک جو کچھ کفایت کے خیال سے ان کے ہاں لپک آئے تھے۔ اب سب سیلونوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان لوگوں نے منشی کی بات کا یقین کیا نہ کچھ کہا۔ بہر حال وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے چونکہ منشی اب کے اپنے ایک بھائی سے سو روپے قرض لے آیا تھا، اس لیے ان لوگوں کو زیادہ پریشانی نہ اٹھانی پڑی۔ تیسرے مہینے صورتِ حال کچھ کچھ سدھر گئی اور انھوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا مگر چوتھے مہینے آمدنی ایک دم پھر کم ہو گئی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اس دفعہ منشی نے ان کی امداد کرنے سے بالکل معذوری ظاہر کر دی۔ اس نے کہا:

”بھائیو! اگر میرے پاس روپیہ ہوتا یا میں کہیں سے لا سکتا تو میں آپ کے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔ لیکن میرے پاس جو کچھ تھا، میں پہلے ہی آپ کی نذر کر چکا ہوں۔“

اس روز تو انھوں نے زیادہ اصرار نہ کیا مگر دوسرے دن صبح ہوتے ہی چاروں کے چاروں نے پھر منشی کو آ گھیرا، جب ان کی خوشامدوں اور التجاؤں کی حد نہ رہی تو منشی نے کہا ”اچھا بھائیو! شام تک صبر کرو۔“ شام ہوئی تو وہ چاروں حجاموں سے یوں مخاطب ہوا: ”صاحبو! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان کی حالت کبھی نہیں سدھرے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی اپنی جو تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں، آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دکان چلے اور آپ کی پریشانیاں دور ہوں تو سب سے پہلے آپ اپنی اصلاح کیجیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ سب اپنے اپنے اخراجات کم کیجیے اور دوسرے یہ کہ اپنی اتنی ہی تنخواہیں مقرر

کیجیے جتنی عام طور پر اس قسم کے سیلونوں میں ملازموں کو دی جاتی ہے۔ اگر آپ میری تجویز کی ہوئی تنخواہ منظور کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، بلکہ اس بات کا ٹھیکہ لیتا ہوں کہ ہر مہینے آپ کو پوری تنخواہ ملا کرے گی۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے کہنے پر چلیں تو آپ کو ہر مہینے کی پہلی کو پیشگی ہی تنخواہ مل جایا کرے گی۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا، اس سے آپ کو مطلب نہیں، چاہے میں چوری کروں، ڈاکہ ڈالوں۔ مگر آپ کو تنخواہ پیشگی ہی ملتی رہے گی۔ آپ نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی ہے کہ میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور بھائیو! اگر آپ کو یہ شرط منظور نہ ہو تو آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں آپ کے لیے روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد استاد نے منشی سے پوچھا: ''اچھا بتاؤ تو تم ہماری کیا کیا تنخواہ مقرر کرتے ہو؟'' منشی نے جواب دیا ''گستاخی معاف! میں زیادہ سے زیادہ آپ کو اسی روپے دے سکتا ہوں۔ دوسرے نمبر والے کو ساٹھ، تیسرے کو پچاس اور چوتھے کو چالیس۔ اگر آپ لوگ یہ تنخواہیں منظور کریں تو ابھی جا کر، چاہے مجھے دُگنے تگنے سود پر قرض ہی لینا پڑے، آپ سب کے لیے دو سو تیس روپے بطور پیشگی تنخواہ کے لے آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ہر مہینے اسی طرح آپ کو پیشگی تنخواہ ملا کرے گی۔

یاد رکھو میرے دوستو یہ تنخواہیں کسی بڑے ہیئر کٹنگ سیلون کے ملازموں کی تنخواہوں سے کم نہیں ہیں۔ آپ لوگ جا کر خود دریافت کر سکتے ہیں البتہ اپنے ملازموں کو پیشگی تنخواہ دینا صرف اسی سیلون کی خصوصیت ہوگی'' منشی کی یہ تقریر سن کر چاروں حجام گم صم سے رہ گئے اور کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا مگر یہ خاموشی بڑی صبر آزما تھی۔ انھوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر گردنیں جھکا لیں۔

گنڈاسا

اکھاڑہ جم چکا تھا۔ طرفین نے اپنی اپنی "چوکیاں" چن لی تھیں۔ "پڑکوڈی" کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔ انہوں نے رنگین لنگوٹیں کس کر باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سے سفید پھینٹھیے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرے بنا رہے تھے۔ وسیع میدان کے چاروں طرف گپوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اتری تھیں۔ یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدت سے تیل چپڑوا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ کی چمک نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا۔ پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں آئے، انہوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے سامنے ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی۔

"مولا کہاں ہے؟"

مولا ہی کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دور دراز کے دیہات سے کھنچے چلے آئے تھے۔ "مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں!"

دوسرا بھنور پیدا ہوا اور لوگ پوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھنے لگے۔ جما ہوا پڑ ٹوٹ گیا۔ منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طوفان اڑانے کی کوشش کی کہ پڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا، مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں سیروں بارود بھرا ہوا ایک گولا ایک چکرا دینے والے دھماکے سے پھٹ پڑا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ پڑ کی چوکور حدوں کی طرف واپس جانے لگے۔ مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے سجے اور لدے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھو کر یا علیؑ کا نعرہ لگانے کے لیے ہاتھ ہوا میں بلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈاسا بن کر پڑی۔ "مولے"۔ "اے مولے بیٹے۔ تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اٹھا ہوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں نتھنے نکل آئے۔ "رنگے نے تیرے باپ کو ادھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" ان کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!

پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی کپڑے پہننے لگے۔ ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولے کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندتے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا۔ بہت پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھڑی سینے سے لگائے آ رہا تھا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے ایک خوف زدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں، بھیڑوں، بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک اور ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے: "رک جا مولے!"

مولا لپکا چلا گیا، مگر پھر ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لیے گئے اور وہ بت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے: "تو آگے نہیں جائے گا مولے!"

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر بولا "آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"

"میں کہہ رہا ہوں۔" پیر جی... "میں" پر زور دیتے ہوئے دبدبے سے بولے۔

مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا: "تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالیے اور ناک بھی کاٹ ڈالیے میری، مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی۔ بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو میں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا۔"

مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کے چوپال کی طرف دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے بٹھوں پر گنڈاسے چڑھائے چوپائے پر تنے کھڑے تھے۔ رنگے کا بڑا لڑکا بولا:

"آؤ بیٹے آؤ۔ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر نہ اگل ڈالوں تو قادا نام نہیں۔ میر اگنڈاسا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلا نہیں لیتے، روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔"

مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ ایک ہی رفتار میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل چپڑ رکھا تھا اس لیے وہ روکنے والوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جاتا، مگر پھر جکڑ لیا جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار گنڈاسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک جیسے سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں بلند کیے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلائے: "اس کلام اللہ کا واسطہ! اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ورنہ بد بختو گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا۔ جاؤ تمھیں خدا اور رسولؐ کا واسطہ، قرآن پاک کا واسطہ، جاؤ، چلے جاؤ۔"

لوگ سر جھکا کر ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ مولا نے جلدی سے تائے سے پٹکا لے کر ادب سے اپنے گھٹنوں کو چھپا لیا اور سیڑھیوں پر سے اتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لیے اس کے پاس آئے اور بولے: "اللہ تعالیٰ تمھیں صبر دے اور آج کے اس نیک کام کا اجر دے۔"

مولا آگے بڑھ گیا۔ تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کی چوپال پر ایک نظر ڈالی۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" تاجے نے بڑے دکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا۔ "تو کیا اب رووٴں بھی نہیں؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟" تاجے نے مشورہ دیا۔

"ہاں تاجے!" مولے نے دوسری بار بازو آنکھوں پر رگڑا۔ "میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میرے باپ کے خون پر مکھیاں اڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بھاگا جا رہا ہوں، ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لیے!"

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں۔ وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اس کے باپ کی لاش تھانے اٹھا لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ منہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اس کے پاس آئی اور "شرم تو نہیں آتی" کہہ کر منہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اسی طرح تنے رہے۔ اس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہو گی کہ رنگے کی چوپال پر قیامت مچ گئی۔ رنگا چوپال کی سیڑھیوں پر سے اتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر ابل کر اس کے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔ کافی دیر کو افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لیے گاؤں سے نکلے، مگر جب وہ تھانے پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں وہ اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر "قل ھو اللہ" کا ورد کر رہا تھا۔ تھانے دار سے انہوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا، مگر تھانیدار نے انہیں سمجھایا کہ "خواہ مخواہ اپنے باپ کے قاتل کو ضائع کر بیٹھو گے، کوئی عقل کی بات کرو۔ ادھر یہ میرے پاس اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے، ادھر تمہارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھی بھونک آیا ہے۔"

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے، لیکن دونوں قتلوں کا کوئی چشم دید ثبوت نہ ملنے کی بنا پر طرفین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں سے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرانے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ کر گلے لگایا اور کہا: "اس روز تم اور تمہارا گھوڑا میرے کام

نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا۔ تمہاری جان کی قسم! جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا، آندھی بن گیا خدا کی قسم.... اسی لیے تو لاش ابھی تھانے بھی نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھاڑ کر واپس بھی آ گیا۔"

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے، مگر مولے کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادر کے گنڈاسے سے مرا تھا، رنگا تو صرف ہشکار رہا تھا بیٹوں کو۔ رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح کو پتا چلا کہ قادر اپنے کوٹھے کی چھت پر مردہ پایا گیا اور وہ بھی یوں کہ جب اس کے بھائیوں پھلے اور گلے نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی اور مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا، تپتی دوپہر میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا۔ کتنی راتیں اسے اونگھنے تک نہ دیا گیا، مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آ نکلا اور جب اس نے آنگن میں قدم رکھا تو ماں بھاگی ہوئی آئی۔ اس کے ماتھے پر طویل بوسہ دیا اور بولی: "ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے، تو جبھی بتیس دھاریں بخشوں گی۔ میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے، اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔"

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔ اس کی مونچھوں میں دو دو بل آ گئے تھے۔ کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں، خوشبودار تیل اس کے لہریئے بالوں میں آگ کی قلمیں سی جائے رکھتا۔ ہاتھی دانت کا ہلالی کنگھا اتر کر اس کی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا۔ وہ گلیوں میں چلتا تو پٹھے کے تہبند کا کم سے کم آدھا گز تو اس کے عقب میں لوٹتا ہوا جاتا۔

باریک ململ کا پٹکا اس کے کندھے پر پڑا رہتا اور اکثر اس کا سرا گر کر زمین پر گھسٹتے چلا جاتا۔ مولا کے ہاتھ میں ہمیشہ اس کے قد سے بھی لمبی تلی پلی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوراہے پر بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اس کے گھٹنے سے آ لگتی اسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ مولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لیے کہہ سکیں۔ اگر کبھی لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تن گئی تو لوگ آتے، مولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے۔ عورتوں اور بچوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں جہاں مولا بیٹھنے کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ مولا کی لٹھ پر سے الانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اس گلی میں سے گزر ہوا، مولا اس وقت ایک دیوار سے لگا لٹھ سے دوسرے دیوار کریدے جا رہا تھا۔ اجنبی آیا اور لٹھ پر سے الانگ گیا۔ ایکا ایکی مولا نے بپھر کر ٹینک میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا: "ٹھہر جاؤ چھوکرے، جانتے ہو تم نے کس کی لٹھ الانگی ہے، یہ مولا کی لٹھ ہے۔ مولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان مولا کا نام سنتے ہی یک لخت زرد پڑ گیا اور ہولے سے بولا: "مجھے پتا نہیں تھا، مولے۔"

مولا نے گنڈاسا اتار کر ٹینک میں اڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا: "تو پھر جا اپنا کام کر۔" اور پھر وہ لٹھ کو یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

مولا کا لباس، اس کی چال، اس کی مونچھیں اور سب سے زیادہ اس کا لاابالیانہ انداز، یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے، لیکن مولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی لانبی لٹھ تھی۔ تیل پلی، پیتل کے کوکوں سے اٹی ہوئی، لوہے کی شاموں میں لپٹی ہوئی، گلیوں کے کنکروں پر بجتی اور یہاں سے وہاں تک پھیل کر آنے والوں کو پلٹا دینے والی لٹھ اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ٹینک تھی اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک نقطہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔

لوگ کہتے تھے کہ مولا گلیوں کے نکڑوں پر لٹھ پھیلائے اور گنڈاسا چھپائے گلے اور پھلے کی راہ تکتا ہے۔ قادرے کے قتل اور مولے کی رہائی کے بعد پھلا فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا اور گلے نے علاقہ کے مشہور رسہ گیر چوہدری مظفر الٰہی کے ہاں پناہ لی تھی، جہاں وہ چوہدری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں چوری کر کے لاتا۔ چوہدری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں، وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور

اخباروں میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چوہدری مظفر کے قصبے کے قریب پہنچتے تو جی میں کہتے: "ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا!"

انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چوہدری کے گھر تک جا پہنچے تو پھر کچھ دیر بعد لوگ مویشیوں کی بجائے خود کھوجیوں کا سراغ لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔ وہ چوہدری کے خوف کے مارے قصبے کے ایک طرف سے نکل کر تھلوں کے ریتے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے: "کھروں کے نشان یہاں سے غائب ہو رہے ہیں۔"

مولا نے چوہدری مظفر اور اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اسے کچھ ایسا لگتا تھا کہ جیسے علاقہ بھر میں صرف یہ چوہدری ہی ہے جو اس کی لٹھ الانگ سکتا ہے، لیکن فی الحال اسے رنگے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

تاجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولے کو ڈانٹا "اور کچھ نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر، یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں اور میراثیوں، نائیوں سے خدمتیں لی جا رہی ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے کر ڈرانے لگی ہیں۔ لڑکیاں تو تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتی ہیں۔ کسی کو بددعا دینی ہو تو کہتی ہیں اللہ کرے تجھے مولا بیاہ کرلے جائے۔ سنتے ہو مولے!"

لیکن مولا تو جس بھٹی میں کودا تھا اس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا: "ابے جا تاجے اپنا کام کر، گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی جی داری کی بات ہے پٹھے، تیرا جی چھوٹ گیا ہے تو میری آنکھوں میں دھول کیوں جھونکتا ہے۔ جا اپنا کام کر، گنڈا سے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی.... جا...."

اس نے لاٹھی کو کنکروں پر بجایا اور گلی کے سامنے والے مکان میں میراثی کو بانگ لگائی: "ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا الو کے پٹھے، جا کر گھر والوں کی گود میں سو گیا، چلم لا۔"

تاجا پلٹ گیا، مگر گلی کے موڑ پر رُک گیا اور مڑ کر مولے کو کچھ یوں دیکھا جیسے اس کی جوان مرگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اُٹھا اور لٹھ کو اپنے پیچھے گھسیٹتا تاجے کے پاس آکر بولا: دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے اس لیے کہ کسی زمانے میں تیری یاری تھی پر اب یہ یاری ٹوٹ گئی ہے۔ تاجے تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر ایسی یاری کو لے کر چاٹنا ہے۔ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ رنگے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب چک جائے۔ میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں تک پہنچے گا، اس لیے جا اپنا کام کر۔ تیری میری یار ختم۔ اس لیے مجھ پر ترس نہ کھایا کر، کوئی مجھ پر ترس کھائے تو آنچ میرے گنڈاسے پر جا پہنچتی ہے، جا۔"

واپس آکر مولا نے میراثی سے چلم لے کر کش لگایا تو سلفہ ابھر کر بکھر گیا۔ ایک چنگاری مولا کے ہاتھ پر گری اور ایک لحہ تک وہیں چمکتی رہی۔ میراثی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا تو مولا نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میراثی بل کھا کر رہ گیا اور ہاتھ کو ران اور پنڈلی میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا: "ترس کھاتا ہے حرامزادہ۔"

اس نے چلم اُٹھا کر سامنے دیوار پر پٹخ دی اور لٹھ اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ عورتیں سر پر گھڑے رکھے آئیں اور "ہائیں" کرتی واپس چلی گئیں۔

مولا اس وقت دور مسجد کے مینار پر بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔ اچانک اسے کنکروں پر لٹھ کے بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اُٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے اور ان لانبی سرخ مرچوں کو چن رہی ہے جو جھکتے ہوئے اس کے سر پر رکھی ہوئی گھڑی میں سے گر گئی تھیں۔ مولا سناٹے میں آگیا، لٹھ کو الانگنا تو ایک طرف رہا، اس نے یعنی ایک عورت ذات نے لٹھ کو گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر پرے ڈال دیا ہے اور اب بڑے

اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چن رہی ہے اور جب مولا نے کڑک کر کہا: "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟ تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچیں گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے کہا کوئی سڑی لگتے ہو۔"

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی اسی لیے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پر نہیں دے ماری۔ ایسے لٹے لٹے سے لگتے تھے مجھے تو تم پر ترس آگیا تھا۔"

"ترس آگیا تھا؟ مجھ پر؟ مولا پر؟" مولا دھاڑا۔

"مولا!" لڑکی نے گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور ذرا سی چونک گئی۔

"ہاں مولا، گنڈاسے والا" مولا نے بڑے ٹھسے سے کہا۔

اور وہ ذرا سی مسکرا کر گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا، پھر لمبی سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار پر پھیلایا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ مولا نے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا: "آجاؤ ماسی، آجاؤ میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔"

حواس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی۔ "کیسا جھوٹ بکتے ہیں لوگ۔ کہتے ہیں جہاں مولا بخش بیٹھا ہو وہاں سے باؤ کتا بھی دبک کر گزرتا ہے، پر تُو نے میرے لیے اپنی لٹھ..."

"کون کہتا ہے؟" مولا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب کہتے ہیں، سارا گاؤں کہتا ہے۔ ابھی ابھی کنویں پر یہی باتیں ہو رہی تھیں، پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا..."

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک گیا تھا جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دور لمبی گلی کے سرے پر وہی لڑکی جاتی نظر آئی۔ وہ بھاگنے لگا۔ آنگنوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں دروازوں تک آگئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے کا ہی پیش خیمہ سمجھا گیا۔ لڑکی نے بھی مولا کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ وہ پلٹی اور پھر وہیں جمی کھڑی رہ گئی۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، چند مرچیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

"میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" مولا پکارا۔ "کچھ نہیں کہوں گا میں تمہیں۔"

لڑکی بولی: "میں ڈر کے نہیں رکی۔ ڈریں میرے دشمن۔"

مولا رک گیا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا: "بس اتنا بتا دو تم ہو کون؟"

لڑکی ذرا سا مسکرا دی۔

عقب سے بڑھیا کی آواز آئی۔ "یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر راجو ہے، مولا بخش!"

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ٹینک تک گیا اور پھر رسے کی طرح لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولا نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا: "ٹھہرو راجو! یہ اپنی مرچیں لیتی جاؤ۔"

راجو رک گئی۔ مولا نے جھک کر ایک ایک مرچ چن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے انہیں راجو کی گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے بولا: "تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا نا راجو؟"

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے راستے پر ہو لی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا: "یہ تمہاری لٹھ تو یہیں رکھی رہ گئی مولا بخش!"

مولا پلٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا: "ماسی! یہ لڑکی راجو کیا یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہیں کی ہے بھی بیٹا اور نہیں بھی۔" بڑھیا بولی۔ "اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اٹھا کر اتنی دور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اکھیڑی اور یہاں سے یوں سمجھو کہ کوئی دو ڈھائی کوس دور ایک ڈھوک بنالی۔ وہیں راجو اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ تیسرے چوتھے روز گاؤں میں سودا سلف خریدنے آجاتی ہے اور بس۔"

مولا جواب میں صرف "ہوں" کہہ کر واپس چلا گیا، لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا ایک دو بار نام آیا، مگر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا نا، اور راجو رنگے ہی کے بیٹے کی منگیتر تھی... اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔"

اس واقعے کے بعد مولا گلیوں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی باہر جاتا بھی تو کھیتوں، چراگاہوں میں پھر پھرا کے واپس آجاتا۔ ماں اس کے رویے پر چونکی، مگر صرف چونکنے پر اکتفا کی۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں۔ وہ بھی جو بہا بہا دیئے گئے اور وہ بھی جو بہائے نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پر اسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ مولا کی ماں بھی چولہا جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان کی چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔ یکایک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے فوراً لٹھ پر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گلی سے لالٹینیں نکلی آرہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر جو نیزوں، برچھیوں سے لیس تھے، بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں سے ہنکائے لیے جا رہے تھے کہ چوکیدار نے انہیں ٹوکا اور جواب میں انہوں نے چوکیدار کو گالی دیتے ہوئے کہا: "یہ مال چوہدری مظفر الٰہی کا ہے۔ یہ گلی تو خیر ایک ذلیل سے گاؤں کی گلی ہے، چوہدری کا مال تو لاہور کی ٹھنڈک سڑک پر سے بھی گزرے تو کوئی اف تک نہ کرے!"

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چوہدری مظفر خود، بہ نفسِ نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا اس سے گنڈاسا چھیننا چاہتا ہے۔ کڑک کر بولا: "چوری کا مال میرے گاؤں سے نہیں گزرے گا، چاہے یہ چوہدری مظفر کا ہو چاہے لاٹ صاحب کا۔ یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو!" اس نے لٹھ کو جھکا کر گنڈاسے کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا۔ "جاؤ۔"

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا۔ "جا کر کہہ دو اپنے چوہدری سے کہ مولا گنڈاسے نے تمہیں سلام بھیجا ہے، اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔"

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو چپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا: "یہ سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں۔ ان کے مالک پرسوں تک آنکلیں گے کہیں سے، اور گاؤں کی عزت میری عزت ہے ماں۔"

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے۔ یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافت طے کر کے کھوجیوں کی ناز برداریاں کرتے یہاں پہنچے تھے اور یہ سوچتے آرہے تھے کہ اگر ان کا مال چوہدری کے حلقۂ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہو گا۔ اور جب مولا ان کا مال ان کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں گلی میں جمع ہو گیا تھا اور اس ہجوم میں راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جما کر ایک مٹی کا برتن رکھا ہوا تھا۔ اور منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا: "آج بہت دنوں کے بعد آئی ہو راجو۔"

"کیوں؟"

اس نے کچھ یوں کہا جیسے "میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں" کا تاثر پیدا کرنا چاہتی ہو۔ "میں تو کل بھی آئی تھی اور پرسوں بھی اور ترسوں بھی۔ ترسوں تھوم پیاز خریدنے آئی۔ پرسوں بابا کو حکیم کے پاس لائی تھی، کل ویسے ہی آ گئیں اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں۔"

"کل ویسے ہی کیوں آ گئیں؟" مولا نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ویسے ہی بس جی چاہا آ گئے، سہیلیوں سے ملے اور چلے گئے، کیوں؟"

"ویسے ہی...." مولا نے بجھ کر کہا۔ پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا۔ "یہ گھی بیچو گی؟"

"ہاں بیچنا ہے! پر تیرے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔"

"کیوں؟"

"تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔"

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنی لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چُل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا اور اسے انگلیوں میں ملنے مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لیے مڑی تو مولا ایک دم بولا: "دیکھو راجو! میرے ہاتھوں پر تو خون ہے ہی، اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا، پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے۔ میرے ہاتھ نہ بیچو، میری ماں کے ہاتھ بیچ دو۔"

راجو کچھ سوچ کر بولی: "چلو.... آؤ...."

مولا آگے آگے چلنے لگا۔ جاتے جاتے جانے اسے کیا وہم گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ اور پٹوں کو گھورے جا رہی تھی۔ ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں چکتے ہوئے مرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ فوراً بولا: "یہ چوزے میرے ہیں۔"

"ہوں گے۔" راجو بولی۔

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا، بولا: "ماں! یہ سب گھی خرید لو۔ میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں۔"

راجو نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تا کہ بڑھیا گھی سونگھ لے، مگر وہ اندر چلی گئی تھی ترازو لینے، اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھنوؤں کو مس کر لیں گی، اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں، اور اس کے ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے قطرے چمک رہے ہیں، اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے، اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے جو کچھ یوں اُچٹا ہوا سا الگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اُڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بُندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں، اور ان بُندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔

مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یونہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے۔

ماں ترازو لے کر آئی تو راجو بولی: "پہلے دیکھ لے ماسی، رگڑ کر سونگھ لے۔ آج صبح ہی کو تازہ تازہ مکھن گرم کیا تھا، پر سونگھ لے پہلے!"

"نہ بیٹی میں تو نہ سونگھوں گی"۔ ماں نے کہا۔ "میرا روزہ مکروہ ہوتا ہے!" پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر کے بعد بولی: "تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟"

"ہاں!"

"تو پھر جا..." ماں نے ترازو اُٹھا کر ایک طرف پٹخ دی۔ تجھے حوصلہ کیسے ہوا میرے یہاں قدم دھرنے کا۔ رشتہ قتلوں کا اور سودے گھی کے، جا!"

پھر وہ مولا کی طرف مڑی۔ "جن پر گنڈاسے چلانے ہیں ان سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان! یہ گلے کی منگیتر ہے گُلے، رنگے کے بیٹے کی!"

راجو، جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا، جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اُٹھی اور بولی: "تمہارے سینوں میں دل ہیں یا خشخاش کے دانے۔"

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ بھنا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی ہوئی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ یونہی دیر تک دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں اسے اُٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا۔

"تم رو رہے ہو مولے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مولا بولا: "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

ماں چکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی۔

اب مولا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر نورے نائی کے ہاں پڑا رہتا۔ نورے نے وہاں چائے کی دُکان کھول رکھی تھی۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوانوں اور بچوں کا ایک ہجوم لگ جاتا۔ سب نورے کی چائے پیتے اور ڈرائیور سے شہروں کی خبریں پوچھتے، اور مولا ان سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا۔ اب لوگ مولا کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کے پاس سے حقہ تک اُٹھا لاتے، مگر کسی کو اس کی لٹھ کو چھونے یا الانگنے کی جرات نہیں ہوئی، جو وہاں کھٹولے کے ساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلی لاری آکر رُکی اور اس میں سے مسافر اُترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈے پر اُلو بول گیا۔ لاری میں سے رنگے کا بیٹا گُلا اُترا۔ اس کے پیچھے چار بڑے قد آور گھبرو اُترے اور پھر پانچوں ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے۔

مولا اس سناٹے سے چونکا اور چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر نورے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے تیزی سے چارپائی پر سے نیچے پاؤں لٹکائے اور ٹینک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا۔

"حقہ لانا نورے" وہ پکارا۔ اور زرد رو نورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پاس حقہ رکھ کر غڑاپ سے دُکان کے اندر چلا گیا۔

اب پانچوں نوروارد لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے، جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اُڑا دیا۔

"مولے!" گلے نے اسے للکارا۔

"کہو۔" مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دھواں گلے کی طرف اُڑا دیا۔

"ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں۔"

"کہو کہو۔"

"گنڈاسا ایک طرف رکھ دو۔ ہم بھی خالی ہاتھ ہیں۔"

"لو۔" مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم جیسے دیوار سے چمٹ کر رہ گیا۔ بچے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آوے پر چڑھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" مولا نے گلے سے پوچھا۔

گلا جو اَب اس کے پاس پہنچ گیا تھا، بولا: "تم نے چوہدری مظفر کا مال روکا تھا؟"

"ہاں" مولا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "پھر؟"

گلے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بولا: "چوہدری نے تمہیں اس کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم یہ انعام ان سارے گاؤں والوں کے سامنے تمہارے حوالے کر دیں۔"

"انعام!" مولا چونکا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

گلے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولا کے منہ پر مارا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا: "یہ بات ہے۔"

تڑپ کر مولا نے لٹھ اٹھائی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔ پانچوں نووارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے، مگر گلا لاری کی پرلی طرف کنکروں پر پھسل کر گر گیا۔ لپکتا مولا رُک گیا، اٹھا ہوا گنڈاسا جھکا اور جس زاویے پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا....

دم بخود ہجوم دیوار سے اُچٹ اچٹ کر آگے آ رہا تھا۔ بچے آوے کی راکھ اڑاتے بھاتے ہوئے اُتر آئے، نورا دکان میں سے باہر آ گیا۔

گلے نے اپنی انگلیوں اور پنجوں کو زمین میں یوں گاڑ رکھا تھا، جیسے دھرتی کے سینہ میں اتر جانا چاہتا ہے۔

اور پھر مولا، جو معلوم ہوتا تھا کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گیا ہے، ایک قدم آگے بڑھا، لٹھ دور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دی اور گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا: "چوہدری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے، رسید میں خود پہنچانے آؤں گا۔"

اس نے ہولے ہولے گلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا: "رسید تم ہی کو دے دیتا پر تمہیں تو دولہا بننا ہے ابھی.... اس لیے جاؤ، اپنا کام کرو...."

گلا سر جھکائے ہولے ہولے چلتا گلی میں مڑ گیا۔

مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اور جب اس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آوے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آ کر نہایت وحشت سے بولنے لگی: "تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے! ارے تُو تو میرا حلالی بیٹا تھا۔ تیرا گنڈاسا کیوں نہ اٹھا؟ تو نے...."

وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی: "تُو تو رو رہا ہے مولے؟"

مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا: "تو کیا اب روؤں بھی نہیں!"

آخری آدمی

(انتظار حسین)

الیاس اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کرتے تھے نابود ہو گئے۔ پر اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجر وم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و پریشان واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اے عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے ہنسا۔ "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔" اور وہ ہنستا چلا گیا، حتٰی کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرا بگڑ گیا ہے۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور دانت کھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہوا اور ابن زبلون کا چہرہ غصے سے اور الیاب کا چہرہ خوف سے بگڑ تا چلا گیا۔ ابن زبلون غصے سے آپے سے باہر ہوا اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا چلا گیا اور وہ دونوں کہ ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوت تھے آپس میں گتھ گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضا بگڑے۔ پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخ بن گئیں اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقل مند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا۔ تشویش سے کہا کہ اے لوگو! ضرور ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاس لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا۔ اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا

کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو! وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لئے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آلیا۔

دہشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں۔ اور خد و خال مسخ ہوتے چلے گئے۔ اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ جاننا چاہئے کہ وہ بستی ایک بستی تھی۔ سمندر کے کنارے۔ اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی، بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کٹورا بجتا تھا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں۔ اور اونچے برجوں میں عالی شان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہر اس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے ایک احساسِ برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا۔ تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی۔ اس نے ان کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا مگر اسے اچانک زبان کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انہی میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کئے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے منڈنے لگا۔ اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی۔ اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آ گئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ کے لئے اسے ٹٹولا جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا لمبے بال اس کی رات کی بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں۔ اور پیٹ اس کا گندم کی ڈیوڑھی کی مانند ہے اور پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیر اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ ساس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا۔ جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضر! تو کہاں ہے اور اے وہ کہ جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھاری مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہو گئیں اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے؟ اے اخضر کی بیٹی! اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ۔ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا کہ اس کا جی بھر آیا اور بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک الیعذر کی جورو یاد آئی جو الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی۔ حالانکہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقوش بگڑتے چلے گئے۔ اور ہڑکی کی آواز وحشی ہوتی چلی گئییہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا۔ بنت الاخضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی۔ اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور الیاسف نے اپنے تیئں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور کھڑی دم دیکھ کر ہنسا اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں۔ اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کہ میں انگور کے خوشے توڑوں گا اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔

الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جوئیں بن بن کر کھاتی تھی۔ الیعذر جھری جھری لے کر کھڑا ہو جاتا اور وہ دم کھڑی کر کے اپنے لجلجے پنجوں پر اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوتی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنسی کی ایسا بن جائے اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے غصہ اور ہمدردی سے رونے اور ہنسنے سے ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا، دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا، کچے کچے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا۔ یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا، کبھی ہنساتا تھا۔ کبھی غصہ دلاتا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگا اور انہیں حقارت سے دیکھتا اور یوں ہوا کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود اپنی آواز پر حیران ہوا۔ اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا۔ اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر کی جاتی رہی۔ کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال بن کر رہ گیا۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ آج لفظ مر گیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصے اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے در گزرا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر جزیرے کے مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان اور جزیرے نے کہا میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی، غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں کہ جذبے کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود میں اندر سے بدل رہا ہوں تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے کہ اس کے اعضاء خشک، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے۔ اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے خوف آیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سمٹنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور سر چھوٹا ہوتا جا رہا ہے تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضاء اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طور غلبہ پاؤں گا جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پا لیا۔ اور اس کے سمٹتے ہوئے اعضاء دوبارہ کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے۔ اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور لجلجے ہو گئے اور اس کے جوڑ کھلنے لگے اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضاء بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھا اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بدہیئت اعضاء کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضاء کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں میں نہیں رہا۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھینے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضاء پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضاء تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضاء بگڑتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اور گزری راتیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کا مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا۔ اور اس کی ہوس بڑھتی گئی اور انہوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا کہا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کی مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا سمندر تمہارے دستِ ہوس سے پناہ مانگتا ہے اور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا اور الیاسف عقل کا پتلا تھا۔ سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملا دیا اور سبت کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے پر نکل گئیں۔ اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔ اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے نے تو مجھے ایسا پیدا کیا جیسے پیدا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا۔ اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے تو اب مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا اور الیاسف اپنے حال پر رویا۔ اس کے بنائے پشت میں دراڑ پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب اس بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی۔ اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لئے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں پر چھپ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے اعضاء پر نظر کی کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کیا میں میں ہی ہوں اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بیشک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور وہ پکارا کہ اسے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔

جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آ رہا تھا اور الیاسف نے درد سے صدا کی۔ کہ اے بنت الاخضر اے وہ جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑی دودھیا گھوڑیوں کی قسم ہے۔ قسم ہے کبوتروں کی جب وہ بلندیوں پر پرواز کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے اور نیند کی۔ اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو مجھے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں۔ جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی ہوئی آواز پر غور کیا اور زبلون اور

الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا۔ اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔